



# دوقومی نظریہ

ڈاکٹر سید عزیز حسین میرا

# دوقومی نظریہ

منہ بولے حقائق

احمد سعید



نظریہ پاکستان ٹرسٹ

## جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

کتاب کے مندرجات کی ذمہ داری مصنف پر ہے

کتاب	:	دوقومی نظریہ: منہ بولتے حقائق
مصنف	:	احمد سعید
ناشر	:	نظریہ پاکستان ٹرسٹ، لاہور
مطبع	:	نظریہ پاکستان پرنٹرز، لاہور
مہتمم اشاعت	:	رفاقت ریاض
ڈیزائنر	:	محمد شہزاد یسین
کمپوزنگ	:	محمد شاہد گلزار
اشاعت دوم	:	اکتوبر 2009ء
تعداد اشاعت	:	500
قیمت	:	425 روپے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: [www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

Published by

**Nazaria-i-Pakistan Trust**

Alwan-i-Karkunan-i-Tehreek-i-Pakistan,

Madar-i-Millat Park, 100-Shahrah-i-Quaid-i-Azam, Lahore.

Ph. 9201213-9201214 Fax. 9202930 E-mail: [trust@nazariapak.info](mailto:trust@nazariapak.info)

Web: [www.nazariapak.info](http://www.nazariapak.info)

Printed at: Nazaria-i-Pakistan Printers,  
10-Multan Road, Lahore. Ph: 7466975





## ابتدائی کلمات

نظریہ پاکستان ٹرسٹ کی غرض و غایت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے مقاصد اور اس کیلئے دی جانے والی قربانیوں کو اجاگر کیا جائے، نظریہ پاکستان کی ترویج و اشاعت کی جائے اور اہل وطن بالخصوص نئی نسل کو پاکستان کی نظریاتی اساس اور عظیم تاریخی و تہذیبی ورثے سے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے نظریہ پاکستان ٹرسٹ نے وطن عزیز کی نئی نسل کو اپنی سرگرمیوں کا محور و مرکز بنایا ہے کیونکہ ہماری نسل نو ہی ہمارے ملک و قوم کا مستقبل ہے اور ان کے فکر و عمل کو علامہ محمد اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے افکار و کردار کے سانچے میں ڈھال کر ہی ہم اپنے مستقبل کو زیادہ روشن اور محفوظ بنا سکتے ہیں۔ اس کے لئے نظریہ پاکستان ٹرسٹ ایک ہمہ جہت پروگرام پر عمل پیرا ہے جس میں مطبوعات کی اشاعت کا سلسلہ اہم ترین حیثیت کا حامل ہے۔ ان مطبوعات کے ذریعے ہم نئی نسل کو نظریہ پاکستان، تحریک پاکستان اور مشاہیر تحریک پاکستان کے افکار و تصورات کے بارے میں نہایت سادہ زبان میں آگہی فراہم کر رہے ہیں اور ان میں اپنے ملک و قوم کے حوالے سے احساسِ تفاخر پیدا کر رہے ہیں تاکہ وہ مستقبل میں اپنی قومی ذمہ داریوں سے زیادہ احسن انداز میں عہدہ برآ ہو سکیں۔

قائد اعظمؒ کی بے لوث اور عہد ساز قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی بیش بہا قربانیاں پیش کر کے اگرچہ پاکستان تو

حاصل کر لیا مگر ہم اسے قائد اعظم اور علامہ محمد اقبال کے افکار کے مطابق اسلامی نظریہ حیات کا قابل تقلید نمونہ نہیں بنا سکے۔ بانی پاکستان کے وصال کے بعد قوم کے نام نہاد قائدین نے ان کے نظریات سے انحراف کو اپنا وطیرہ بنا کر اس ملک کو فوجی و سول آمریتوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ علامہ محمد اقبال کے تصور پاکستان اور قائد اعظم کی جدوجہد کے باعث اگرچہ ہمیں انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط اور غلبے سے نجات حاصل ہو گئی مگر آج ہم ایک دوسری طرح کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے گئے ہیں جس سے نجات کے حصول کے لئے ہمیں از سر نو قائد اعظم اور علامہ محمد اقبال کے افکار کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ صرف اسی طرح ہم وطن عزیز کو ایک جدید اسلامی، فلاحی اور جمہوری مملکت بنانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

قائد اعظم کی زیر قیادت تحریک پاکستان میں طلباء و طالبات نے ہر محاذ پر مسلم لیگ کے ہر اول دستے کا کردار ادا کیا تھا اور ان کی شب و روز جدوجہد کے طفیل برصغیر کا ہر گوشہ ”پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ“ کے روح پرور نعروں سے منور ہو گیا تھا۔ بابائے قوم نے بارہا ان کی خدمات کو سراہا تھا اور ان پر اظہارِ فخر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ”یہی ہیں وہ مردانِ عمل جو آئندہ ہماری قوم کی تمناؤں کا بوجھ اٹھائیں گے۔“ مجھے قوی امید ہے کہ زیر نظر تصنیف کا مطالعہ ہماری نئی نسل میں اس عقابِ روح کو بیدار کر دے گا جو تحریک پاکستان کا طرہ امتیاز تھی اور وہ نظریہ پاکستان کی مبلغ بن کر پاکستان کو علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصبات سے رہائی دلا کر وطن عزیز کی کشتی ساحلِ مراد تک پہنچائے گی۔

محمد زریں

(مجید نظامی)  
چیمبرمین



# فہرست

صفحہ نمبر	عنوان
6	پیش لفظ
9	قومیت کا مفہوم
10	دوقومی نظریہ: تاریخی پس منظر
10	اسلام کا نظریہ قومیت
11	مسلمانوں کا واحد ذریعہ ہدایت
12	ہندومت کا نظریہ قومیت
13	ہندو مذہب کا بانی کوئی ایک شخص نہیں
14	ہندوؤں کا جامد طبقاتی ڈھانچہ ہزاروں ذاتوں میں منقسم ہے
16	برصغیر میں اسلام کی آمد، تبلیغ دین اور دوقومی نظریہ
17	مسلم فاتحین و صوفیائے کرام کی آمد
20	برصغیر پر انگریزوں کا قبضہ اور دوقومی نظریے کا ارتقا
25	دوقومی نظریہ: سال بہ سال پیش کی جانے والی تجاویز کا جائزہ
47	دوقومی نظریہ: مسلمانوں کی ترقی کا ضامن
47	دوقومی نظریہ اور ہندوؤں کی تنگ نظری
50	حوالہ جات

## پیش لفظ

دو قومی نظریہ دراصل قیام پاکستان کی بنیاد ہے اور یہ نظریہ بالکل درست ہے۔ قیام پاکستان کے پس منظر میں جھانکیں تو ہمیں دو قومی نظریے کی تفصیل، تعریف اور صحیح معنوں میں افادیت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دو قومی نظریہ ہی درحقیقت نظریہ پاکستان ہے۔

نظریہ پاکستان وہ منطقی نظر ہے جس کی بنیاد ایک مخصوص نظریے یعنی اسلام پر رکھی گئی ہے جو اپنی تہذیب ثقافت، اقدار و روایات اور اپنا سیاسی و معاشی نظام فکر رکھتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو اپنی شناخت اور پھر دو قومی نظریہ کی بنیاد پر جد اگانہ ریاست کی ضرورت یوں شدت سے محسوس ہوئی کہ ان کے ساتھ موجود ایک دوسرے نظریے کے حامل افراد جو مسلمانوں کے تو حید اور انسانی مساوات کے نظریہ حیات کے برعکس بت پرستی اور ذات پات کے قائل تھے انہیں اپنے اندر جذب کر کے اپنے نظام فکر و عمل کا حصہ بنانا چاہتے تھے لیکن اس کے برعکس اس خطے میں بسنے والی ملت اسلامیہ اپنے قومی تشخص اور علیحدہ شناخت کو چھوڑنے کے لیے کسی صورت تیار نہ تھی۔ یہ ملت اسلامیہ اپنے نظام فکر کو نہ صرف قائم رکھنا چاہتی تھی بلکہ عملی طور پر اس کے ظہور کی بھی خواہش مند تھی۔ دونوں قوموں کے درمیان یہی امتیازی خصوصیات دو قومی نظریے کی بنیاد ہیں جو محض نظریہ ہی نہیں بلکہ روزمرہ پیش آنے والی حقیقت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے فرزندانوں نے ایسے علاقوں پر مشتمل علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا، جن میں مسلمان اکثریت میں تھے۔

ایک اللہ، ایک قرآن اور ایک رسول ﷺ کے ماننے والے افراد ایک ایسے رشتے میں بندھے ہوئے تھے کہ اس سے الگ ہونا موت کے مترادف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دو قومی نظریے کی بنیاد پر شروع کی گئی تحریک ایک مردِ مومن کی خداداد بصیرت، انتھک محنت اور پُر عزم حوصلے کی

بدولت منزل مراد تک پہنچی۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی دیرینہ خواہش تھی کہ ان کی زندگیاں بھی ان ثمرات سے بہرہ مند ہوں جو اسلامی نظام فکر کی دین ہے۔ اسلام آزادی فکر و عمل، عدل اور اخوت و مساوات کا دین ہے اور جس کے نفاذ سے قرونِ اولیٰ کے مسلم معاشروں کو دنیا بھر کے مثالی معاشروں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان بھی اپنی زندگیاں اس عظیم معاشرتی سانچے میں ڈھالنے کے آرزو مند تھے اور یہ عظیم معاشرتی سانچہ انہیں ایک علیحدہ اسلامی ریاست کی شکل میں ہی میسر آ سکتا تھا۔ ہندوؤں کی تہذیب و ثقافت، روایات و اقدار، مذہب و سیاست اور تاریخ و ادبیات مسلمانوں سے یکسر مختلف تھیں۔ ان کے درمیان شادی بیاہ کا ہونا ممکن تھا نہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی سکتے تھے۔ یہ دونوں تو میں دو مختلف تہذیبوں کی علمبردار تھیں جو ایک دوسرے کی ضد تھیں۔

ظاہر ہے کہ جب مسلمان اپنی جداگانہ تہذیب و اقدار اور مذہب و روایات کے لحاظ سے ایک مختلف شخص کے حامل تھے تو انہیں اپنا شخص برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ آئے دن کے نظریاتی، مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی تصادم سے نجات حاصل کریں۔ یہی علیحدہ شخص کی خواہش دراصل دو قومی نظریے کی اصل ہے۔ یعنی برصغیر جنوبی ایشیا میں مسلمان ہر لحاظ سے ایک علیحدہ شناخت اور پہچان کی حامل قوم ہے جس کا کوئی انگ، ڈھنگ یا رنگ ہندوؤں سے مشابہت نہیں رکھتا۔ اسی دو قومی نظریے کی بنیاد پر مسلمانوں نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا، ایک ایسا وطن جس میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا تحفظ ہو، جو اسلامی معاشرے کی تشکیل کا محور ہو، جہاں ہندوؤں کی تنگ نظری اور معاشی استحصال کا کوئی وجود نہ ہو، جہاں پر امن و فضا میں مسلمانوں کی جان و آبرو اور مال و متاع محفوظ ہو، جہاں ان کے زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں ہندو تعصب اور تنگ نظری آڑے نہ آتی ہو۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کو سمجھنے کی نوجوان نسل کو اشد ضرورت ہے۔

اس کتابچے میں جہاں دو قومی نظریے کے پس منظر اور افادیت کے حوالے سے بات



ہوتی ہے وہاں دو قومی نظریے کی تاریخی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کوشش کی گئی ہے کہ ان تمام شخصیات کا ذکر کر دیا جائے جن کے حوالے سے تاریخ میں دو قومی نظریے پر مبنی تجاویز ملتی ہیں۔ لیکن یہ ایک ابتدائی کوشش ہے جو یقیناً آنے والوں کے لیے تحقیق و جستجو کے نئے دروا کر نے کا سبب ہوگی۔ اس کتابچے کی تیاری کے دوران مجھے اپنے استاد محترم ڈاکٹر منیر الدین چغتائی سے رہنمائی ملتی رہی۔ اُن کے ساتھ ساتھ مجھے نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن کے سیکرٹری جناب ڈاکٹر رفیق احمد کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے اس تحقیقی کام کی تیاری کے مختلف مراحل میں نہایت مفید مشورے دیے اور وقتاً فوقتاً اہم نکات کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ اس کتابچے کی تدوین میں برادر محترم جناب منظر علوی کی معاونت بھی شامل حال رہی جس کے لئے میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

## قومیت کا مفہوم:

دو قومی نظریہ کیا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ اور اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ ان تمام سوالات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے معنی و مفہوم کے بارے میں تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ ”انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا“ کے مطابق قومیت کا مفہوم نام صفات اور متعدد اوصاف کا مرکب ہے جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو۔ ایسا گروہ جو نسل، روایات اور مشترکہ مفادات، عادات اور رسوم کا حامل ہو۔ ان میں سب سے اہم چیز ایک دوسرے کو سمجھنے کا عمل ہے۔ اس وجہ سے ان میں آپس میں محبت و الفت پیدا ہوتی ہے اور دوسری اقوام کے لوگ ان کو غیر اور اجنبی محسوس ہوتے ہیں<sup>1</sup>۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے مطابق:

”جذبہ انفرادیت اور اس کی بقا کی خواہش ہی دراصل ہماری قومیت کی بنیادیں ہیں۔ اس بزرگ عظیم کے مسلمان چودہ سو سال سے ساتھ رہنے ایک ضابطہ حیات کا پابند ہونے، عروج و زوال، ترقی و انحطاط میں شراکت کی وجہ سے ایک قوم بن گئے اور تمام ذیلی اختلافات کے باوجود ان میں صدیوں میں جذبہ قومیت پرورش پا کر مستحکم ہو گیا۔ اگر یہ جذبہ قومیت استوار نہ ہوتا تو بزرگ عظیم کے مسلمان کبھی کے بندوؤں میں مدغم ہو گئے ہوتے“<sup>2</sup>۔

ڈیوڈ رابرٹسن نے قوم کو افراد کے ایسے مجموعے سے تعبیر کیا ہے جسے چند مخصوص جذبات نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ اس کے دو عناصر ہیں: پہلا نسل، دوسرا مذہب لیکن اس کے ساتھ ساتھ مشترکہ لٹریچر سے دلچسپی، ماضی کے مشترکہ کارناموں اور مصائب کی یادیں، رسوم و عقائد، مقاصد اور عزائم افراد کو باہم پیوست و مربوط رکھتے ہیں یعنی ایک قوم بناتے ہیں<sup>3</sup>۔

منتخب یہ کہ افراد کا وہ گروہ جس کا مقصد حیات ایک ہو قوم کہلاتا ہے۔

### دو قومی نظریہ ..... تاریخی پس منظر:

حضرت آدم سے لے کر اب تک دنیا میں دو قسم کے انسانوں کا گروہ ہمیشہ سے موجود رہتا چلا آ رہا ہے۔ پہلا گروہ وہ ہے جو دنیا میں امن و سلامتی ترقی و استحکام کا خواہاں ہے۔ دوسرا گروہ شریک و تباہی کا علم بردار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی بقا و اصلاح کے لیے اپنے منتخب بندوں یعنی پیغمبروں کی جماعت کو دنیا میں بھیجا تا کہ وہ اپنی سیرت و کردار سے لوگوں کی اصلاح کریں۔ جو لوگ فطرتاً اصلاح پسند تھے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کو سمجھا اور انبیاء کے اس عظیم مشن میں ان کا ساتھ دیا لیکن شر پسند جماعت کے افراد نیک لوگوں اور ان کے مشن کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے چنانچہ خیر و شر کی یہ جنگ اب تک جاری ہے۔

تمام انبیاء اور اولیاء نے اللہ کے اسی پیغام کو دنیا میں پھیلایا لیکن نبی کریم حضرت محمد ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء اور سردار الانبیاء ہیں اس لیے ان کے دین اسلام کی کھانیت اور پیغام ناقیامت رہے گا۔ قرآن کا پیغام صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی باعث ترقی و فلاح ہے۔

### اسلام کا نظریہ قومیت:

اسلام کے عالمگیر نظریہ قومیت کی بنیاد صرف مذہب یعنی اسلام پر ہے۔ اسلام کی نظر میں نسل و زبان علاقائیت کی بنیادیں اور تمام امتیازات باطل اور غیر ضروری ہیں۔ مدینہ منورہ کی فلاحی ریاست میں اگرچہ یہودی، عیسائی اور بت پرست رہتے تھے مگر حضور ﷺ نے یہاں جو قوم تشکیل دی اس کی بنیاد اتقویٰ پر رکھی۔ اس ریاست میں حضرت بلال حبشی، افریقہ سے حضرت سلمان فارسی، ایران سے حضرت صہیب رومی، روم سے اور بے شمار صحابہ کرام دنیا کے مختلف گوشوں سے یہاں آئے تھے۔ اسلام سے قبل ان صحابہ کا رنگ و نسل، قوم و روایات، طرز بود و باش سب مختلف

تھا لیکن دین اسلام کی وجہ سے وہ ایک قوم بن گئے۔ اب ان کی پہچان دین اسلام تھا۔

### مسلمانوں کا واحد ذریعہ ہدایت: قرآن و سنت

دنیا بھر کے مسلمان ایک وسیع اخوت و بھائی چارے کے احساس میں منسلک ہیں۔ وہ ایک نصب العین کو پانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ایک خدا کے عقیدے پر اپنی زندگیاں گزارتے ہیں۔ اسلام میں قومیت کی بنیاد رنگ، خون، نسل، جغرافیائی حدود کے ایک ہونے پر نہیں ہے۔ اسلام کی دعوت کسی فرق و امتیاز کے بغیر ساری نوع انسانی کے لیے ہے۔ اسلام بنی آدم کو خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے جو کائنات کی تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے۔ ہر بشر اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ لوگ صداقت، امن، عدل اور سلامتی کی فضا میں اپنی زندگیاں بسر کریں۔ کسی شخص کی کسی خاص نسل یا قبیلے میں پیدائش کی اسلام میں کوئی اہمیت نہیں بلکہ اللہ کی نظر میں سب سے اچھا وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: الکفر ملتہ و احدہ ”کفر ملت واحد ہے“ یعنی کافر دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں وہ اسلام کے نظریات کے مخالف ہیں۔ اسی طرح مسلمان اپنے مشترکہ نظریہ اسلام کی وجہ سے ملت واحد ہیں۔ گویا آنحضرت ﷺ نے روئے زمین پر بسنے والوں کو دو قوموں اور دو طبقوں میں تقسیم کر دیا: (1) ملت کفر (2) ملت اسلام۔ اسلام کی عظمت، آفاقیت اور حیران کن جاذبیت سے ملت کفر ہمیشہ خائف رہی۔ اسلام سے متعلق ابہام و شکوک پیدا کرنے کے لیے تحریکیں چلیں۔ کتابیں تھیں اور فلمیں بنائی گئیں لیکن اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔

مسلمانوں کی ہدایت کا واحد ذریعہ چونکہ قرآن و سنت ہے، لہذا اس رو سے بھی دیکھا اور پرکھا جائے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورۃ کافرون میں دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے متمیز کرنے کے لیے خط امتیاز پہنچ دیا ہے۔ خدائے واحد و بزرگ و برتر نے صاف صاف الفاظ میں ارشاد فرما دیا ہے کہ کافروں کا دین ان کے لیے اور مومنوں کا دین ان کے لیے۔ کہا گیا ہے کہ کہہ دیجیے کہ



جسے تم پوجتے ہو اسے میں نہیں پوجتا اور جس کی عبادت میں کرتا ہوں اسکی عبادت تم نہیں کرتے۔  
اس لحاظ سے دو قومی نظریے کی بنیاد ازل سے ہی چلی آرہی ہے۔

### ہندومت کا نظریہ قومیت:

برصغیر جنوبی ایشیا میں جب ہندو آریا پہلے پہل داخل ہوئے تو ان کے مذہبی تصورات نہایت سادہ تھے۔ انہی تصورات و عقائد کو ان کی مذہبی کتابوں (ویدوں) میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے بعد جو زمانہ آیا اس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ یعنی برہمنوں کی مذہبی حکمرانی قائم ہو گئی اور انہوں نے اپنی برتری کے جواز میں جو مذہبی کتابیں ترتیب دیں انہیں برہمنہ کہا۔ برہمنہ کا بڑھ مت اور جین مت کی کتابوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں واقعات و حالات کو توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے اور قدیم ویدی عقائد میں اس طرح ترمیم کی گئی ہے جس سے برہمنوں کی پیشوائیت کا تسلسل ثابت ہو۔ اس لیے ان کتابوں میں ہندو مذہب کی صحیح نمائندگی نہیں کی گئی۔

ویدوں میں ان بڑی بڑی ارواح کو اگوہیت کا جامہ پہنایا گیا جو فطرت اور اس کے مظاہر و قوی کی نگران ہیں لیکن ارواح سفلی کا جن سے لوگ ڈرتے تھے اور جنہیں راضی رکھنے کے لیے پوجا پاٹ کرتے تھے ویدوں میں بھی کوئی ذکر نہیں۔ ویدک مذہب میں ہر اس شے کو معبود قرار دیا جاتا تھا جس سے انسانی ذہن پر ہیبت طاری ہو جاتی ہو یا جس سے خوف اور امید کے جذبات وابستہ ہو جائیں۔ زمین، آسمان، پہاڑ، دریا، پودے، قابل پرستش سمجھے جاتے تھے۔ گھوڑے، گائے، پرندوں اور دوسرے جانوروں سے بھی مرادیں طلب کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ خود انسان کی بنائی ہوئی اشیاء مثلاً ہتھیار، طبل وغیرہ کی عبادت بھی کی جاتی تھی۔

وید مذہب کی ایک خصوصیت ارواح پرستی ہے۔ اس کا مرکزی تصور یہ ہے کہ عالم میں ایک یا بہت سی طاقتیں کارفرما ہیں۔ یہ طاقتیں جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں اور بڑے بڑے درختوں کو اپنا مسکن بناتی ہیں۔ ان میں خیر کی نسبت شر کی صلاحیت زیادہ ہے اس لیے انہیں راضی رکھنا ضروری ہے۔

## ہندو مذہب کا بانی کوئی ایک شخص نہیں:

زرتشت، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی مانند ہمیں کوئی ایسی شخصیت نہیں ملتی جس کو ہندوؤں کا رہنما قرار دیا جاسکے یا جس کو اس مذہبی نظام میں مرکزی اہمیت حاصل ہو۔ اس طرح ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو بھی کسی ایک شخصیت کی جانب منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ ہندو مذہب کے ابتدائی مدارج پر لاتعداد شخصیات کا ٹھہرا ہوا ہے۔ چونکہ ہندوؤں کے مذہبی نظام کی تشکیل میں لاتعداد اشخاص کا حصہ ہے اس لیے اس میں کوئی واحد عقیدہ نہیں۔ مذہبی قوانین و رسوم و شعائر کی عدم یکسانیت عقائد کی بولچھنی، طریق عبادت کے اختلاف اور معبودوں کی کثرت کے باعث یہ مذہب ایک گنجان جنگل کی طرح ہے جس میں ہزاروں راستے ہیں لیکن کوئی راستہ صاف اور سیدھا نہیں۔

برصغیر کے حوالے سے یہاں یہ ذکر بھی کر دینا ضروری ہے کہ سکندر اعظم کے یونانی جانشینوں کے عہد میں بہت سے ایرانی ایشیا میں آکر بس گئے جو سورج کی پرستش کرتے تھے اور برہمنوں نے انہیں اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ انہی کے اثر سے ہندوستان میں سورج اور آگ کی پرستش کا آغاز ہوا۔ ہندو مذہب کی بے یقینی صورت حال کا صحیح منظر پنڈت جواہر لال نہرو (1889ء-1964ء) کی رائے سے عیاں ہوتا ہے۔

وہ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:-

”ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد

خیالات و رسوم داخل ہیں اسی لیے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں

میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا“<sup>4</sup>۔

پنڈت نہرو اپنی ایک اور کتاب ”Discovery of India“ میں ہندو ازم پر

تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ہندو ازم بحیثیت ایک عقیدہ کے بالکل مبہم، غیر متعین اور بہت

سے گوشوں والا واقع ہوا ہے جس میں ہر شخص کو اس کے مطلب کے مطابق بات مل جاتی ہے۔ اس کی جامع اور مکمل تعریف ممکن نہیں۔ حتمی طور پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آیا یہ کوئی مذہب ہے بھی یا نہیں یہ اپنی موجودہ شکل و صورت میں بہت سے عقائد اور رسوم کا مجموعہ ہے<sup>5</sup>۔

ہندوؤں کی کوئی تاریخ کہیں بھی محفوظ نہیں اور جس قوم کی تاریخ محفوظ نہیں رہتی اس کا قومی تشخص بھی باقی نہیں رہتا۔ مؤرخین کی تحقیق کے مطابق 1200ء سے پہلے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں ایسی کوئی قابل ذکر کتاب نہیں جس کو تاریخ کی کتاب کہا جاسکے یا کوئی ایسی کتاب جس سے اس ملک کے تاریخی حالات معلوم ہو سکیں۔

## ہندوؤں کا جامد طبقاتی ڈھانچہ ہزاروں ذاتوں میں منقسم ہے :

ہندو مذہب یا دھرم کی تمام عمارت انسانی تفریق چھوت چھات اور توہمات پر کھڑی ہے جس کا بنیادی پتھر ذات پات کا ناقابل تقسیم اور ناقابل تنسیخ نظام ہے جبکہ عقائد اس میں قانونی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو مذہب کے مطابق یہ قوم چار ذاتوں پر مشتمل ہے:-

1- **برہمن** جو برہما کے سر سے پیدا ہوا۔ سر چونکہ جسم کا سب سے افضل اور بہتر حصہ ہوتا ہے اس لیے یہ قوم پیدائشی طور پر سب انسانوں سے افضل و برتر سمجھی جاتی ہے۔

2- **کھشتری** جو برہما کے بازوؤں سے پیدا ہوا۔

3- **ویش** جو برہما کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

4- **شودر** جو برہما کے پاؤں سے پیدا ہوا اور اچھوت کہلایا۔

ہندوؤں نے ذات پات کی اہمیت و تعریف یوں بیان کی ہے کہ اس کے تحت معاشرہ متعدد خود کفیل اور مکمل طور پر الگ الگ ذاتوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ان ذاتوں کے باہمی تعلقات

مذہب کی رو سے مرتبے کے فرق کے مطابق طے ہوتے ہیں<sup>6</sup>۔

ہندو مذہب میں چھوت چھات کا کس قدر عمل دخل ہے اس کا اندازہ آپ اس بات سے ہی لگالیں کہ وہ اپنی ہی قوم کے چوتھے درجے کے ہندو شودر (Dalit) سے کیا سلوک کرتے ہیں۔ ذیل میں ہندوؤں کا شودروں، غیر ہندوؤں اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ انداز معاشرت اور ہندو مذہب کی تاریخ اور مخصوص سوچ کے بارے میں مزید وضاحت البیرونی کی معروف کتاب ”کتاب الہند“ کے ایک اقتباس کی روشنی میں بہتر انداز میں ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ برصغیر میں دو قومی آباد تھیں جن کو بالآخر دو قومی نظریے کی بنیاد پر الگ الگ وطن کی ضرورت کا ہمدست سے احساس ہوا۔

**البیرونی (1048ء-973ء):**

البیرونی جو 1020ء کے لگ بھگ ہندوستان آئے، اپنی کتاب ”کتاب الہند“ میں ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ اور معاشرتی رویے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”مسلمانوں کو یہ پیچھ (ناپاک) کہتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ مسلمانوں سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، قریب رہنا، مل کر بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے۔ اگر کسی مجبوری کے تحت ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ ہاتھ ملانا پڑ جائے تو اپنے ہاتھ پر رومال لپیٹ کر مصافحہ کرتے ہیں۔ صدیوں سے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دل میں جو نفرت کا لاوا پک رہا تھا، یہ سب کچھ اس کا نتیجہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے، ذلیل و خوار کرنے، نفرت سے دور رکھنے اور قتل و غارت سے نیست و نابود کرنے کو ایک اہم مذہبی فریضہ تصور کرتے ہیں“<sup>7</sup>۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب اسلام کی بنیاد خدا کے صحیح تصور اور اس کی توحید پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مذہب انسانی دماغ کی تخلیق ہو یا جن الہامی مذاہب میں انسانوں نے ذاتی مفاد کی خاطر



تحریف کر دی ہو اُن میں خدا کا تصور ذہنِ انسانی کا تراشیدہ ہوگا اور چونکہ ذہنِ انسانی محسوسات سے آگے نہیں بڑھ سکتا، اس لیے ان کا تخلیق کردہ خدا بھی اسی قالب میں ڈھلا ہوا ہوگا۔

ہندو مذہب میں سانپوں کی پرستش، بانجھ گائے کے بالوں اور کھروں کو سجدہ، گھوڑوں اور گھوڑوں کے مالکوں کو سجدہ، نائی کے اُسترے اور سردی سے چٹھنے والے بخار کو سجدہ کرنے کی تلقین موجود ہے۔

### برصغیر میں اسلام کی آمد، تبلیغِ دین اور دو قومی نظریہ:

زمانہ قدیم سے اہل عرب کے شرقِ قریب اور شرقِ بعید سے تجارتی روابط قائم تھے۔ قبل از اسلام عربوں کے تجارتی جہاز جنوبی ہندوستان کی بندرگاہوں سے گزرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ہندوستان پر حملے کیے گئے۔ حکم بن ابی العاص نے بحری بیڑا تیار کر کے تھانہ اور بھڑوچ پر حملے کیے۔ بحریہ کے لیے وسائل اور تجربہ کم ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے بحری جنگوں کی مخالفت کی لیکن جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا تو انہوں نے سندھ کی فتوحات میں بہت دلچسپی لی۔ وہ سندھ کے حالات سے مکمل واقفیت رکھتے تھے۔

عرب جنوبی ایشیا میں آباد تھے۔ تجارت پیشہ لوگ اس وقت اہل عرب سے باہمی تجارت کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ عرب تاجروں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ساحلِ سمندر کے کناروں پر آباد تھیں۔ مکران کے ساحلوں سے لے کر ساحلِ مالابار تک عرب تاجروں کے مقامی آبادی سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ برصغیر میں اسلام کی شروعات تقریباً اُسی دور میں ہو گئی تھی جب مکہ مکرمہ میں پیغمبرِ آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے کوہِ صفا پر جا کر اہل مکہ کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ ساحلِ مالابار پر آباد عرب تاجروں کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے عرب سے آنے والے دوسرے تاجروں سے حالات معلوم کیے اور اسلامی اخلاق اور اسلامی معاشرے کی بنیاد ڈالی۔ برصغیر میں ساحلوں پر موجود عرب تاجروں کو مقامی آبادی نے ”موپلا“ یعنی دولہا بھائی کا نام دے رکھا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عرب تاجروں کی شرافت

اور دیانتداری کی وجہ سے مقامی لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے تھے، دوسرے ہندوؤں کے معزز گھرانے ان ”موپلوں“ سے اپنی لڑکیوں کی شادی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ساحلِ مالابار کے لوگ ان علاقوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کو سامری کہتے تھے۔ ساحلِ مالابار کی ریاست کا ایک سامری جس کا نام پیرومل تھا، مسلمانوں کے اخلاق اور شرافت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام عبدالرحمن رکھا گیا۔ اپنی حکمرانی کے دوران ہی عبدالرحمن حج کے لیے روانہ ہوا مگر مکہ پہنچتے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ عبدالرحمن واپس نہ لوٹا تو یہ ایک روایت بن گئی کہ جو بھی مملکت (مالابار) کے تخت پر بیٹھتا، وہ برسرِ عام یہ اعلان کرنا کہ جب تک چچا عبدالرحمن مکہ سے حج کر کے واپس نہیں آ جاتا، اس وقت تک وہ تخت پر بیٹھے گا۔ ان حکمرانوں نے اسلامی طرز حکومت اختیار کرتے ہوئے جنوبی ایشیا کی سر زمین پر ایک نیا اور انوکھا معاشرہ ترتیب دیا۔ یقیناً اس وقت کے مطابق جنوبی ایشیا کے لوگوں کے لیے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس طرح برصغیر میں ریاست مالابار غالباً وہ پہلا مقام ہے جہاں پہلی مرتبہ برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیب نے جنم لیا۔

### مسلم فاتحین و صوفیائے کرام کی آمد

ساحلِ مالابار کے بعد برصغیر میں اسلامی تہذیب کا دوسرا دور 712ء سے شروع ہوتا ہے جب محمد بن قاسم نے مکران کے ساحلوں کے ساتھ واقع دیہلی فتح کیا اور یوں برصغیر اسلامی اصولوں اور اسلامی مساوات سے متعارف ہوا۔ تقریباً تین سو سال تک اسلامی تہذیب آہستہ روی کے ساتھ ان علاقوں میں پروان چڑھی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ تبلیغ اسلام کو بہت ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سندھی امیروں کے نام خطوط لکھے جن میں انہیں اسلام کی دعوت دی گئی۔ ان کی دعوت پر جو سندھی امرا شرف بہ اسلام ہوئے، ان میں راجہ داہر کا فرزند بے سنگھ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس دوران بہت سے مدوجز آئے۔ تقریباً تین سو سال کے بعد ایک بار پھر محمود غزنوی نے برصغیر میں ہلچل مچا دی اور برصغیر پر 17 حملے کیے جس سے بعد ازاں سلطان محمد

غوری کے دور میں اسلامی تہذیب کی حامل مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ حکومت کی برصغیر میں داغ بیل پڑی۔ مسلمان برصغیر پاک و ہند میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ان میں ایرانی، افغانی، ترکی، تورانی جیسی مختلف النسل اقوام کے افراد شامل تھے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد عربی، افغانی، مصری اور دیگر اقوام کے افراد برصغیر میں آتے رہے جو یقیناً مختلف النسل تھے اور برصغیر کے اسلامی معاشرے میں ضم ہوتے رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسلام کسی قسم کی تفریق اور ذات پات کی تمیز پر یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی امتیازی نسلی رشتے سے اس کا کوئی واسطہ ہے۔ یہ مختلف النسل اقوام ہندوستان میں آباد ہو گئیں جنہوں نے دراوڑوں یا آریاؤں کی مانند یہاں کی مقامی آبادی کو نقل مکانی پر مجبور نہیں کیا بلکہ اسلام کے آفاقی اصولوں پر مبنی ایسا معاشرہ تشکیل دیا جس نے یہاں کی مقامی آبادی کو مسلمانوں کی جانب متوجہ کیا۔

اسلام میں برتری صرف اس کو حاصل ہے جو نیک اور پاکباز ہو۔ اسلام نے ایک ایسا ضابطہ حیات فراہم کیا ہے جو راستی، انصاف، مساوات، رحمدلی اور برداشت کے اصولوں پر مبنی ہے۔ برصغیر میں ہندو قوم نے اب تک وارد ہونے والے تمام فاتحین کو اپنے اندر اس لیے جذب کر لیا تھا کہ وہ تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے ہی دست تھے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنا تمدنی نظام اور فلسفہ حیات رکھتے تھے۔ مسلمانوں کا اپنا جداگانہ تشخص تھا۔ اس لیے برصغیر میں دو جداگانہ تہذیبیں پرورش پانے لگیں۔ اس کے باوجود مسلمان فاتحین نے برصغیر کی غیر مسلم آبادی کو زیادہ سے زیادہ مراعات دیں اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین اقدامات کیے۔

اسی دوران برصغیر میں اشاعتِ اسلام اور مسلم معاشرے کی تشکیل کے لیے دور دراز کے علاقوں سے صوفیائے کرام ہجرت کر کے آئے جن کے حسنِ اخلاق اور نیک سیرت کو دیکھتے ہوئے بعض ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا۔ مسلمان قوم برصغیر میں مساواتِ انسانی اور عدل و اخوت کا عظیم پیغام لائی۔ اسلام چونکہ رنگ و نسل، زبان اور جغرافیے کی تفریق و امتیاز نہیں کرتا، اس لیے مردم گزیدہ مخلوق اس کے دامن میں پناہ لینے لگی۔ اسلام کی تحریک نے صدیوں کی ٹھکرانی

ہوئی انسانیت کو ایک انقلاب سے روشناس کر لیا۔ اسلام کی وجہ سے مقامی آبادی میں فکری شعور اور مقصدیت جنم لینے لگی جس سے ان کے طرز فکر اور طرز معاشرت میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگیں، یعنی ہندوؤں کی ذہنی آسودگی نے ارققائی سفر طے کیا۔ مسلمانوں نے اپنی فنی مہارت، جمالیاتی حس اور جوشِ عمل سے قطب مینارِ لال قلعہ تاج محل آگرہ، موتی مسجد اور بادشاہی مسجد جیسی لازوال عمارتیں تعمیر کروائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلم فاتحین نے ہندو رعایا سے برابری بلکہ رواداری کا سلوک کیا۔ مسلمان حکمرانوں کی انصاف پسندی کا زندہ ثبوت بنارس، متھرا اور پورے برصغیر میں پھیلی ہوئی ہندوؤں کی عمارتیں اور خاص طور پر عبادت گاہیں ہیں۔

مسلم حکمران جب تک مضبوط رہے اور ان میں قوت اور صلاحیت رہی، غیر مسلم طاقتیں ان کی فرمانبرداری رہیں لیکن جب مسلم فاتحین میں انحطاط کے آثار نمودار ہوئے، مشرکوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں 1761ء میں ایک اہم موڑ آیا جس سے ان کی بقا اور سلامتی کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔ اسلامی حکومتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرنے جاٹ اور سکھوں نے مسلمانوں کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں مرکزیت ختم ہونے کے سبب ان کی سیاسی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ روہیل کھنڈ، جنوبی ہند، حیدرآباد، بنگال، اڑیسہ اور پنجاب میں چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں تھیں۔ مرکزی حکومت کا دائرہ عمل صرف دہلی کے لال قلعے تک محدود تھا۔

ان حالات میں ایک مردِ خدا حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مسلمانوں کی راہنمائی کا بیڑا اٹھایا۔ آپ نے ملکی حالات کا جائزہ لیا اور یہاں کے حکمرانوں میں جہاد کی صلاحیت نہ پا کر احمد شاہ ابدالی کو مسلمانوں کی مدد کرنے پر آمادہ کیا۔ احمد شاہ ابدالی ہر قسم کے مالی فوائد سے بے نیاز ہو کر صرف جذبہ جہاد کے تحت 1761ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوا۔ پانی پت کی تیسری جنگ میں اگرچہ مسلمانوں کو عظیم فتح حاصل



ہوتی لیکن برصغیر کے مسلم حکمرانوں نے اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہ اٹھایا اور نہ ہی باہمی یگانگت اور اتحاد و سلامتی کی کوئی مربوط کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کے اس دورِ زوال میں بہت سے مجاہدین نے مسلمانوں کی حالت کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ تیتو میر شہید کی فرانٹھی تحریک کے ساتھ ساتھ شاہ اسماعیل اور سید احمد بریلوی نے جہاد کا آغاز کیا۔ یہ تحریکیں جذبہ جہاد سے معمور اور انگریز اور سکھوں کے خلاف تھیں۔

دوسری طرف نواب سراج الدولہ 1757ء اور سلطان ٹیپو شہید نے 1799ء میں غیر ملکی و غیر مسلم سامراج کے خلاف جرات و بہادری کے ساتھ دادِ شجاعت دی۔ اس عزمِ جہاد نے یہ ثابت کیا کہ مسلمان ایک انگِ قوم ہیں اور اپنا قومی تشخص ان کو جان سے پیارا ہے۔ مغلوں کے زوال کے بعد اصلاحی تحریکوں اور مسلم ریاستوں کے نوابوں نے مشرکین سے جہاد کیا۔ اس سے ملتِ اسلامیہ کے تصورِ قومیت اور اتحاد کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہی وہ محرکات تھے جو جداگانہ اسلامی تشخص سے ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے جداگانہ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے مشعلِ راہ بنے۔

### برصغیر پر انگریزوں کا قبضہ اور دو قومی نظریے کا ارتقا:

انگریز سامراج 1600ء میں ایک تاجر کی حیثیت سے برصغیر میں آیا اور ڈھائی سو سال کے عرصہ یعنی 1857ء میں پورے برصغیر پر قابض ہو گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ شروع میں انگریز برصغیر میں ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ وہ تو یہاں کی دولت سمیٹ کر برطانیہ لے جانے کی کوشش میں تھا۔ اس نے کہیں سے تاوان کی صورت میں دولت سمیٹی تو کہیں سے جرمانے عائد کر کے اور کبھی دھونس دھاندلی سے دولت لوٹی۔ اس دوران وہ مسلمانوں سے خائف بھی رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ برصغیر میں اسے صرف مسلمانوں سے ہی زک پہنچ سکتی ہے اس لیے کہ اس نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی۔ انگریز اس بات کو بخوبی جانتا تھا کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود اکثریت پر حکومت کرتے رہے ہیں۔

بندوؤں کی سرشت میں چالاکی، عیاری، بغض، کینہ پروری، دھوکا دہی سب کچھ شامل تھا جس کا انہوں نے ہر موقع پر اظہار کیا۔ انہیں جب مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ہوتا تو انگریز کے خلاف ہو جاتے اور جب انگریز کو بلیک میل کرنا ہوتا تو مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کو بھڑکاتے اور اپنا مفاد حاصل کر لیتے۔ انگریزوں کی وہ حد درجہ خوشامد کرتے۔

انگریز بندوؤں کی اس خوشامد سے پوری طرح واقف تھا۔ یاد رہے کہ کانگریس نے برطانوی وزیر اعظم گلڈسٹون کی سالگرہ منائی تھی۔ اس سے بڑھ کر انگریز کی خوشامد اور کیا ہوگی؟

اسلامی حکومت کے خاتمے نے مسلمانوں میں سیاسی فوقیت، اخلاقی عظمت اور معاشی حالت کو انتہائی کمزور کر دیا تھا۔ اس سانحہ نے مسلمانوں کو حقیقی طور پر متاثر کیا۔ بندوؤں شروع ہی سے غلامی کے نادی تھے اس لیے ان کو اس کا قطعاً احساس نہ ہوا۔ مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ شاندار ماضی اور اپنے اسلاف کے عظیم کارناموں اور تہذیبی اقدار کو بھول جائیں اور کفر کی حاکمیت کو قبول کر لیں۔ اس عالم مایوسی میں اللہ تعالیٰ نے سرسید احمد خان جیسی شخصیت کو منتخب کیا جس نے مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا۔ آپ نے ایگڑھ میں دینی و دنیاوی تعلیم کا آغاز ایک ساتھ کیا۔ آپ کی تحریک نے مسلمانوں کو بندوؤں کی چالوں اور انگریزوں کے حملوں سے محفوظ رکھا اور مسلمانوں میں سیاسی و تعلیمی شعور بیدار کیا۔ ایگڑھ کے تعلیم یافتہ مسلمان تحریک پاکستان کے قائدین بنے جنہوں نے ہندو مہا سجانامی متعصب ہندو جماعت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اسی دوران برصغیر میں انگریزوں نے مغربی جمہوریت کو اپنے مفادات کے حصول کے لیے متعارف کروایا اور یوں بندوؤں کو یہ باور کرایا کہ برصغیر میں دیگر اقلیتوں کے مقابلے میں وہ اکثریت میں ہیں۔ لہذا حکمرانی کا پہلا حق انہی کا ہے۔ بندوؤں کو یہ بات پوری طرح سمجھا دی گئی کہ عددی اکثریت کے بل بوتے پر وہ انگریزوں کے توسط سے ہی اقتدار حاصل کر سکتے ہیں۔ لہذا انہوں نے اپنی پالیسی کا مرکز برصغیر میں حصول اقتدار کو ہی بنایا اور وقت کے ساتھ ساتھ اقتدار کے

حصول کے لیے گر گٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے۔ ہندوؤں کو مسلمان حکمرانوں کی وہ تمام مہربانیاں جو ہزار سال پر محیط تھیں، ظلم و ستم لگنے لگیں اور انہوں نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف زہرا لگنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں انہیں انگریز حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی جس کا ثبوت دیگر تنظیموں اور تحریکوں کے علاوہ آل انڈیائی نیشنل کانگریس کا قیام بھی تھا جسے حکومت برطانیہ کے ایما پر ایک انگریز لارڈ ہیوم نے ہندوؤں کے مفادات کے حصول کے لیے قائم کیا تھا۔ ہندوستان میں جتنی بھی ہندو تحریکیں قائم کی گئیں، وہ سوراخ (آزادی) کے حصول کی تحریکیں کم تھیں اور مسلمانوں کو خدھ کرنے کی زیادہ۔ ہندو مہاسجا، دیو ساج، آریہ سماج، شدھی اور سنگھٹن کے علاوہ ان کی تعلیمی تحریک و دیا مندر اور وار دھاسیکیم کا مقصد بھی یہی تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو ہندومت میں شامل کیا جائے۔ کانگریس کے رہنماؤں کے بیانات کہ مسلمان بدیسی ہیں، اس لئے وہ یا تو ہندوستان سے نکل جائیں یا دوبارہ ہندومت میں شامل ہو جائیں، اس بات کی بار بار تصدیق کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تمام کی تمام تحریکوں کا پس منظر محض اس میں پوشیدہ تھا کہ وہ ہندوستان کی آزادی میں کسی دوسرے کو شریک کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ہندوؤں اور ان کے بڑوں کے نزدیک مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد تھے یا وہ لوگ تھے جو ہندوؤں میں سے تھے لیکن ان سے الگ ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کے نزدیک انہیں اپنے ساتھ لانے کے لیے یہ تین طریقے مناسب سمجھے جاتے تھے:

1- مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر کے ہندو دھرم میں لایا جائے؛

2- مسلمانوں کو ان کے قدیم ملک عرب میں واپس بھیج دیا جائے؛

3- یہ ممکن نہ ہو تو انہیں غلام بنا کر رکھا جائے۔

مسلمانوں سے ہندوؤں کی منافرت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ہندو مسلمان سے ہاتھ ملانا بھی پاپ سمجھتا تھا۔ اگر مسلمان کے ہاتھ کسی ہندو سے مس بھی ہو جاتے تو وہ اس وقت تک چین نہ لیتا تھا جب تک اچھی طرح گنگا بل (دریائے گنگا کے پانی) سے اسے دھو نہ لے۔ بد قسمتی

سے اگر کوئی مسلمان کسی بندو کے برتنوں کو چھو لیتا تو یہ برتن اس کے لیے بھر شٹ (نا پاک) ہو جاتے۔ یہاں تک کہ ریلوے سٹیشنوں اور دیگر اجتماعی مقامات پر علیحدہ علیحدہ پانی ہوا کرتا جسے بندو پانی اور مسلم پانی کہا جاتا تھا (بندو مسلم پانی کی یہ صورت حال آج بھی ہندوستان میں موجود ہے)۔ بھولے سے کوئی مسلمان کسی بندو کے گلاس میں پانی پی لیتا تو بے چارے مسلمان کو جان کے لالے پڑ جاتے۔ غرض مسلمان بندوؤں کے لیے اچھوت کا سادہ رہ رکھتے تھے۔ بندوؤں کے نزدیک ہندوستان میں رہنے والے مسلمان چونکہ شودروں سے مسلمان ہوئے تھے اس لیے وہ بھی شودروں کی طرح تھے۔

ان حالات کے تناظر میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سیاسی میدان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا۔ اس سلوک کی ایک جھلک کانگریسی حکومتوں کے دور میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مختصر یہ کہ 1937ء کے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی کانگریسی وزارتوں نے تعصب اور تنگ نظری کی انتہا کر دی تھی۔ بندوؤں نے اقتدار کے نشہ میں بدست ہو کر مسلمانوں پر وہ ظلم و ستم ڈھائے کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ انتہائی حقارت آمیز سلوک روا رکھا گیا اور جگہ جگہ ان کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔

ایسے میں کانگریس کے تین رنگے جھنڈے (ترنگے) کو سرکاری پرچم کی حیثیت دے دی گئی۔ سرکاری عمارتوں پر لہرائے جانے والے اس ترنگے (جھنڈے) کے آگے جھکنے پر ہر مسلمان مجبور تھا۔ بندے ماترم کے رسوائے زمانہ ترانے کو سرکار کی سرپرستی حاصل ہو گئی اور ہر مسلمان کو متعصب خیالات پر مبنی اس گیت کو پڑھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ہندی اردو تنازع کو مزید ابھارا گیا اور اردو کا تشخص ختم کرنے کے لیے ہندی کی سرپرستی کی گئی۔ اس سے پہلے 1867ء میں بھی بنارس میں بندوؤں کی طرف سے ہندی زبان مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اب موقع ملے ہی بندوؤں نے پوری قوت سے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا اہتمام کر دیا۔ جگہ جگہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا گیا۔ گائے کے ذبیحہ پر پابندی عائد کر دی گئی



حالانکہ مسلمانوں کے نزدیک گائے ایک حلال جانور ہے اور اس کا گوشت کھانا ہر طرح سے جائز ہے لیکن ہندوؤں نے انتہائی متشدد انداز میں گائے کے ذبیحہ کو روکا اور مسلمانوں کو زہر آلود خنجروں کا نشانہ بنایا۔

تعلیم کے حصول کو واردہ اسکیم کا نام دیا گیا اور سکولوں کا نام ودیا مندر رکھ دیا گیا۔ سکولوں میں گاندھی کی مورتی بغرض پوجا رکھی گئی۔ مسلمان بچوں کو بھی اس مورتی کے آگے جھکنا پڑتا۔ گویا مسلمانوں کو ہر طرح سے مجبور کیا گیا کہ وہ ہندو ثقافت اور تہذیب کو اختیار کریں۔ اگر مسلمان مزاحمت کا طریقہ اختیار کرتے تو پُر تشدد کارروائیوں میں ان کی جان مال اور عزت و آبرو کو ہدف بنایا جاتا۔

کھلے نام اسلامی عبادات اور شعائر کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ مساجد کے باہر ناقوس اور ڈھول بجائے جاتے۔ مسلم تہواروں خصوصاً عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فسادات کی آگ بھڑکا دی جاتی۔ مسلمانوں کے مقدس مزارات اور قرآن مجید کی بے حرمتی کے دل سوز واقعات کثرت سے ہونے لگے۔ معاشی اعتبار سے بھی مسلمانوں کو زک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی گئی تاکہ وہ معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کے بوجھ تلے دب کر اپنے عقائد سے بھٹک جائیں اور ہندومت کے جال میں پھنس جائیں۔

مسلمان پہلے ہی معاشی اعتبار سے پسماندگی کا شکار تھے اس پر مستزاد یہ کہ معاشی اعتبار سے مسلمان جن شعبوں سے منسلک تھے یا جو کاروبار اختیار کیے ہوئے تھے ان پر بھاری محصولات اور ٹیکس عائد کر دیئے گئے۔ یہ ٹیکس اور محصولات جبری طور پر وصول کیے جاتے۔ نتیجتاً مسلمان روز بروز معاشی لحاظ سے کمزور ہوتے گئے جبکہ دوسری طرف ہندوؤں کو ہر طرح سے نوازنے کی کوشش کی گئی۔ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ ان حالات میں مسلمان انتہائی کمپرسی کی کیفیت سے دوچار ہو گئے۔

مسلمانوں کی بے یار و مددگاری پر مبنی یہ حالات عرصہ دراز سے چلے آ رہے تھے۔

اس پر 1937ء میں بننے والی ظالم کانگریس وزارتوں نے انتہا کر دی۔ ایسی صورت حال میں کیونکر ممکن تھا کہ مسلمان اس خوش فہمی کا شکار ہوں کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مستقل طور پر رہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 1937ء سے کہیں پہلے مختلف مفکرین اس اظہر من الشمس حقیقت کا ادراک کر چکے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک جگہ رہنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

### دو قومی نظریہ : سال بہ سال پیش کی جانے والی تجاویز :

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کا تصور بہت پرانا ہے۔ دو قومی نظریہ کی روشنی میں برصغیر کی تقسیم کے مبلغین میں نہ صرف مسلمان بلکہ خود ہندو اور انگریز بھی پیش پیش رہے ہیں۔ ذیل میں تقسیم ہند کی تجاویز جو دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پیش کی گئیں، اجمالاً درج کی جا رہی ہیں تاکہ دو قومی نظریے کے نئے جاننے والوں بالخصوص نوجوان نسل کی رہنمائی ہو سکے۔

### سلطان شہاب الدین غوری (5-1401ء):

سلطان شہاب الدین غوری نے ہندو مسلم اختلافات کو ہمیشہ کے لیے طے کرنے کا ایک حل نکالا اور ہندو راجہ پر تھوڑی راج کو تجویز پیش کرتے ہوئے کہا:

”برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی معرکہ آرائی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا واحد حل یہی ہے کہ برصغیر کو دریائے جمنا کو حد فاصل بنا کر اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ مشرقی ہندوستان پر ہندوؤں اور مغربی ہندوستان پر مسلمانوں کا تصرف ہو جائے تاکہ دونوں قومیں امن و امان سے زندگی گزار سکیں۔“

یعنی ”ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور کشمیر کا علاقہ مسلمانوں کو دے دیا جائے اور باقی ماندہ

ہندوستان پر ہندو قابض رہیں<sup>8</sup>۔

**مسٹر جان برائٹ** (1811ء - 1889ء):

مسٹر جان برائٹ نے 1858ء میں حکومتِ برطانیہ کو تجویز پیش کی کہ ہندوستان کو متعدد خود مختار صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے جو بظاہر علیحدہ ہوں لیکن تاجِ برطانیہ کی زیر نگرانی ہوں اور یہ برطانوی اقتدار ختم ہونے پر آزاد اور خود مختار ہو سکیں<sup>9</sup>۔

یاد رہے کہ جان برائٹ کی اس تجویز کی اہمیت کے پیش نظر تانہء اعظم محمد علی جناح نے بھی 31 مارچ 1944ء کو فارمین کرپچین کالج کے طلبہ کے استقبالیے سے خطاب کرتے ہوئے اس کا حوالہ دیا تھا۔

**سر سید احمد خان** (1817ء - 1898ء):

سر سید احمد خان نے 1867ء میں ہندی اردو تنازع کے موقع پر بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیر سے کہا تھا کہ:-

”یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو اور مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ایک کوشش کرنا محال ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ نہیں آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں میں جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر مجھے اپنی پیشین گوئی پر یقین ہے<sup>10</sup>۔“

1883ء میں سر سید نے ایک تقریر میں کہا:-

”فرض کر لیجئے کہ ہندوستان سے تمام برطانوی چلے جاتے ہیں پھر ہندوستان کا حکمران کون ہوگا؟ کیا موجودہ حالات میں ممکن ہے کہ دونوں قومیں برابری کی سطح پر ایک میز پر بیٹھ سکیں گی۔ یقیناً نہیں اس لیے

ضروری ہے کہ دونوں قوموں میں سے ایک دوسری کو فتح کر لے۔ یہ خواہش کہ دونوں قومیں برابری کی سطح پر رہیں ناممکن خواہش کی حیثیت رکھتی ہے<sup>11</sup>۔

**ولفریڈ سکوون بلنٹ** (1840ء - 1922ء):

ولفریڈ سکوون بلنٹ نے 1883ء میں برطانوی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلے کا حل پیش کیا اور کہا:۔  
”ہندوستان کے شمالی صوبے مسلمانوں کو دے دیے جائیں اور جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت قائم کر دی جائے“<sup>12</sup>۔

**بدرالدین طیب جی** (1844ء - 1906ء):

بدرالدین طیب جی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ روشن خیال اور غیر متعصب سیاستدان تھے جو ہندوؤں، مسلمانوں اور پارسیوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ وہ ابتدا میں کچھ عرصہ کانگریس کے صدر بھی رہے لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ مسلمانوں کے ساتھ مسلسل زیادتی ہو رہی ہے۔ جب انہیں دوسری بار کانگریس کی صدارت کی دعوت دی گئی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ 27 اکتوبر 1883ء کو کانگریس کے بانی اے۔یو۔ہیوم کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں: ”خواہ ہم اس بات کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت نیشنل کانگریس کی مخالف ہے اور پھر جب مسلمان مجموعی طور پر ایک قوم کی حیثیت سے کانگریس کے خلاف ہوں تو پھر یہ تحریک نہ عوامی حیثیت رکھتی ہے اور نہ ہی اس ادارے کو قومی کانگریس کا نام دیا جاسکتا ہے“<sup>13</sup>۔

**مولانا عبدالحلیم شرر** (1860ء - 1926ء):

مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے ماہوار رسالے ”مہذب“ (لکھنؤ) (ڈاکٹر وحید قریشی اس رسالے کا نام ”تہذیب“ لکھتے ہیں، دیکھیے ”پاکستان کی نظریاتی بنیادیں“ لاہور 1973ء) میں صفحہ 116-102 پر لکھا ہے۔

”حالات کچھ ایسے ہیں کہ کوئی قوم دوسرے فرقے کے جذبات مجروح کیے بغیر مذہبی رسوم ادا نہیں کر سکتی اور نہ عوام میں اتنی رواداری اور صبر کا اتنا مادہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی توہین کو معاف کر سکیں۔ اگر حالات اس حد تک پہنچ چکے ہیں تو دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان دو صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور آبادی کا تبادلہ کیا جائے۔ ہندوؤں کے رویے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنا ہمساہی بھی نہ بننے دیں گے چہ جائیکہ وہ اپنے مقدر کی گتھیاں ’مسلم مشرکین‘ کو سنانا پسند کریں۔ وہ اذان سننے کے بھی روادار نہیں۔ ان حالات میں تقسیم ہند کی تجویز مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہوگی کیونکہ وہ بھی ہندوؤں سے بیزار دکھائی دیتے ہیں“<sup>14</sup>۔

دوقومی نظریے کی بنیاد پر برصغیر کی تقسیم کی یہ پہلی تجویز ہے جو 1890ء میں پیش ہوئی اور خالص مذہبی بنیادوں پر پیش کی گئی۔ اس میں نہ صرف تقسیم کا مطالبہ تھا بلکہ تبادلہ آبادی کی تجویز بھی شامل تھی۔

**ولایت علی** (\*..... 1918ء):

ولایت علی ایک معروف وکیل تھے اور ”بمبوق“ کے قلمی نام سے مولانا محمد علی جوہر (1878ء-1931ء) کے انگریزی اخبار ”دی کامریڈ“ میں ”گپ“ کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے 10 مئی 1913ء کی اشاعت میں اپنے انٹرویو میں کہا:-

”ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس طرح علیحدہ ہو جانا چاہیے کہ شمالی ہندوستان مسلمانوں اور باقی ہندوستان ہندوؤں کو دے دیا جائے۔ جبکہ چین اور دوسری قوموں کو ہندوؤں کے ساتھ شامل کر دیا جائے“<sup>15</sup>۔



چودھری رحمت علی (1897ء - 1951ء):

چودھری رحمت علی نے 1915ء میں جیسا کہ انہوں نے خود اپنی کتاب ”پاکستان“ میں لکھا کہ یہ نظریہ سب سے پہلے بزمِ شبلی کے افتتاحی خطبے میں پیش کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ہندوستان کا شمالی منطقہ اسلامی علاقہ ہے اس لئے ہم اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کریں گے لیکن یہ اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب اس علاقے کے باشندے باقی ہندوستان سے خود کو الگ کریں۔ اسلام اور خود ہمارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ ہم یہ علیحدگی جلد سے جلد اختیار کر لیں۔

”Now or Never“ (اب یا کبھی نہیں) کے نام سے چودھری رحمت علی نے ایک کتابچے میں لکھا تھا:

”میں یہ اپیل ان تین کروڑ مسلمان باشندوں کی جانب سے کر رہا ہوں جو ہندوستان کی پانچ شمالی وحدتوں میں رہتے ہیں یعنی پنجاب، سندھ، سرحد، کشمیر اور بلوچستان۔ اس کتابچے میں ان تین کروڑ مسلمانوں کی جانب سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان مسلمانوں کو ان کی جداگانہ تاریخ اور مذہبی بنیادوں کے مطابق ایک وفاقی دستور دیا جائے اور ان کی وہ قومی حیثیت تسلیم کی جائے جو ہندوستان کے باقی افراد سے انہیں ممتاز کرتی ہے“<sup>16</sup>۔

بعد ازاں 1940ء میں چودھری رحمت علی نے ایک اور پمفلٹ شائع کیا جس میں انہوں نے تقسیم ہند کی ایک اور تجویز پیش کی جس کے مطابق ہندوستان میں تین مسلم ریاستیں قائم کرنا تھیں: ایک شمال مغرب میں دوسری شمال مشرق میں اور تیسری جنوب میں۔

خیری برادران (عبدالجبار\* ..... 1975ء، عبدالستار\* ..... 1945ء)

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ تقسیم ہند کی دوسری تجویز خیری برادران کی جانب سے پیش کی گئی

جس کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی تھی۔ خیری برادران نے اپنا فارمولہ لاسٹاک ہوم سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ یہ کانفرنس 1917ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس تجویز میں کہا گیا تھا کہ:-

”حقیقی امن کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام محکوم ممالک کو آزاد کر دیا جائے۔ اس کے بغیر جنگ کے بعد بھی امن قائم نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کے لوگوں میں ایسے امور سرانجام دینے کی صلاحیت ہے۔ ہندوستان کو غلام بنائے رکھنے کی یہ دلیل بالکل غلط ہے کہ اس ملک میں کئی مذاہب کے پیروکار اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ آباد ہیں۔“ اس تجویز کے آخر میں کہا گیا کہ:-

”حق و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بعض مسلم صوبے جن کا وجود ختم کر دیا گیا ہے پھر قائم کر دیئے جائیں جیسے بنگال، اودھ، سندھ، کرناٹک، مدراس، میسور اور اس ضمن میں دہلی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا“<sup>17</sup>۔

**سر سلطان محمد شاہ آغا خان (1877ء-1957ء):**

سر سلطان محمد شاہ آغا خان نے برصغیر کے مسلمانوں کی جو خدمت کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آپ مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے اور برصغیر کی سیاسی صورتحال پر اکثر و بیشتر روزنامہ ”The Times“ لندن میں مضامین لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ انہوں نے 1918ء میں ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں یہ ناممکنات میں سے ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ زندگی بسر کریں اس لیے بہتری اسی میں ہے اور ہندو مسلم مسئلہ کا حل بھی یہی ہے کہ ہندوستان کو لسانی، مذہبی، ثقافتی اور نسلی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے<sup>18</sup>۔

**نادر علی** (\*) (.....):

چودھری خلیق الرحماں (1889ء-1973ء) کے مطابق 1921ء میں آگرہ کے ایک وکیل نادر علی نے فرقہ وارانہ مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں انہوں نے برصغیر میں ہندو مسلم مسئلہ کا حل پیش کرتے ہوئے لکھا۔ ”ہندوستان کو مذہبی بنیادوں پر ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کر دیا جائے“<sup>19</sup>۔

**سردار گل محمد خان** (1897ء-1957ء):

1922ء میں حکومت ہند نے ”برینز کمیٹی“ قائم کر کے یہ رپورٹ طلب کی کہ صوبہ سرحد کے کچھ اضلاع سابق پنجاب میں ضم کر دیئے جائیں تو کیا صورت حال ہوگی۔ انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسماعیل خان کے صدر سردار گل محمد خان نے ایک گواہ کی حیثیت میں پیش ہوتے ہوئے کہا:-

”ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ میرا نظریہ ہے کہ 23 کروڑ ہندوؤں کو جنوب اور 8 کروڑ مسلمانوں کو شمال میں تقسیم کر دیا جائے۔ راس کمار سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو اور آگرہ سے پشاور تک کا علاقہ مسلمانوں کو دے دیا جائے“<sup>20</sup>۔

یہاں یہ بات خصوصی طور پر قابل ذکر ہے کہ سردار گل محمد خان نے بھی تقسیم کی بنیاد مذہب یعنی دو قومی نظریے پر رکھی۔

**بھائی پرمانند** (1874ء-1947ء):

بھائی پرمانند آریہ سماج اور ہندو سنگھٹن کے بہت بڑے حامی تھے اور انہوں نے

1923ء میں آریہ سماج اور ہندو سنگھٹن کی تحریکوں پر کتاب بھی شائع کی۔ اس کتاب میں انہوں نے برصغیر میں ہندو مسلم مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ”اس براعظم کو تقسیم کر دیا جائے تاکہ ہندو مسلم مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے پا جائے“<sup>21</sup>۔

**مولانا عبید اللہ سندھی (1872ء - 1944ء):**

مولانا عبید اللہ سندھی ایک غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اسلام کی روشنی نے ان کے دل کو ایسا منور کیا کہ انہوں نے تمام عمر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں گزار دی۔ انہوں نے 1924ء میں ایک کتابچہ بھی شائع کیا جس میں تجویز پیش کی کہ برصغیر کو تین جغرافیائی خطوں میں تقسیم کر دیا جائے اور جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان علاقوں کا اقتدار مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق مولانا نے مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم بھی تسلیم کیا اور اس موضوع پر ایک طویل خط اقبال شیدائی کو لکھا<sup>22</sup>۔

**مولانا حسرت موہانی (1881ء - 1951ء):**

برصغیر کے بے باک صحافی اور حق کو مسلمان رہنما مولانا حسرت موہانی نے 1924ء میں تجویز پیش کرتے ہوئے برصغیر کے لیے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا اور ہندوؤں کو یقین دلایا کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے بعد ہندوستان کو ہندو مسلم دور یا ستوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور ان دونوں کو ایک مرکزی نظام سے وابستہ کر دیا جائے گا۔ یہ بڑا جرأت مندی کا کام تھا کہ اس زمانے میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا نعرہ لگایا جائے اور انگریز کی حکومت کے مکمل خاتمے کا مطالبہ کیا جائے۔ نیز اس طرح انہوں نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کر دیا اور مسلم و ہندو کو دو الگ قومیں قرار دے دیا۔ مولانا حسرت موہانی نے 1921ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے احمد آباد کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

”تمام مسلمان ہندوستان میں بحیثیت اقلیت ہیں لیکن فطرت نے اس کا

بدل اس طرح دیا ہے کہ مسلمان تمام صوبوں میں اقلیت میں نہیں، کچھ صوبوں مثلاً کشمیر، پنجاب، سندھ، بنگال، آسام میں مسلمان اکثریت میں ہیں<sup>23</sup>۔

1924ء میں مولانا حسرت موہانی نے درج ذیل تجاویز پیش کیں:-

- 1- مذہبی بنیاد پر آئندہ کی تقسیم کو تسلیم کر لیا جائے۔
- 2- مسلمان صوبوں کو مسلمان ریاستوں اور ہندو صوبوں کو ہندو ریاستوں میں بدل دیا جائے۔

3- اس طرح ان ریاستوں کی ایک انڈین فیڈریشن قائم کر دی جائے اور وفاقی سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک قومی حیثیت قائم کر دی جائے<sup>24</sup>۔

**مولانا محمد علی جوہر (1878ء-1931ء):**

1916ء سے 1923ء کے درمیان ہندو مسلم فسادات میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہا، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا اور یہ آگ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ اس وقت مولانا محمد علی جوہر ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے داعی تھے۔ مجبوراً انہیں بھی ایک تقریر میں جو انہوں نے 1924ء میں علی گڑھ میں کی، یہ کہنا پڑا: ”اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں خونریزی اسی طرح جاری رہی تو ہندوستان ہندو اور مسلم انڈیا میں تقسیم ہو جائے گا“<sup>25</sup>۔

مولانا محمد علی جوہر نے کہا ”ہندو مسلم ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ یہ کوئی قومی مسئلہ نہیں، لہذا اسے بین الاقوامی سطح پر حل کیا جانا چاہیے“<sup>26</sup>۔

انہوں نے اس مسئلے کی مزید وضاحت یوں کی:-

”ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں دو قومیں رہتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان اور ان دونوں کے ایک دوسرے کے بارے میں احساسات ایسے ہیں جیسے کسی فرانسیسی اور جرمن کے جو کہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوئے



باہم مشترک ہیں، جیسا کہ یورپ کی قومیں۔ یہی بنیادی حقائق ہیں جن پر ہندوستان کی عمارت کھڑی ہے اگر کوئی ایسا آئین اس عمارت پر صحیح طور پر قائم نہ ہو تو یہ عمارت زمین بوس ہو جائے گی<sup>27</sup>۔

**لالہ لاجپت رائے (1856ء - 1928ء):**

مولانا حسرت موہانی کی تجویز کے دُور رس نتائج سامنے آئے۔ یہاں تک کہ ہندو لیڈروں نے بھی مولانا حسرت موہانی کی تجویز سے متاثر ہو کر ہندوستان کی تقسیم کے فارمولے پیش کیے۔ چنانچہ پنجاب کے مشہور کانگریسی رہنما لالہ لاجپت رائے نے 1924ء میں تقسیم ہند کا فارمولا پیش کیا۔ ان کی تجویز کے مطابق ہندوستان کو چار حصوں میں تقسیم کیا جانا تھا جس کے مطابق:-

ایک حصے میں پورا پنجاب، سندھ، سرحد اور دوسرے حصے میں مشرقی بنگال، تیسرے میں وہ علاقے جو کسی مسلم صوبے میں شامل نہ ہوں مگر ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہو، جیسے جموں و کشمیر اور مالابار، ان علاقوں کو مسلم انڈیا قرار دیا جائے۔ چوتھا حصہ باقی ہندوستان پر مشتمل ہو اور یہ ہندو اکثریت کا علاقہ ہوگا<sup>28</sup>۔

لالہ لاجپت رائے کی یہ واضح سوچ اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہندو مسلمان دو الگ قومیں ہیں اور دونوں قوموں میں اتحاد ناممکن ہے۔ اسی دوران لالہ لاجپت رائے نے سی آر اے کو اپنے ایک خط میں لکھا:-

”میں نے گزشتہ چھ ماہ سے زیادہ اپنا وقت مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے قوانین پڑھنے میں گزارا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد نہ صرف ناممکن ہے بلکہ ناقابل عمل بھی<sup>29</sup>۔“

**نواب سرفاضی عزیز الدین احمد بلگرامی (1886ء - 1953ء):**

فاضلی عزیز الدین احمد بلگرامی انگریزوں کی ملازمت میں تھے لیکن برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی صورتحال کو بخوبی سمجھتے تھے۔ انہوں نے مارچ، اپریل 1920ء میں بدایوں کے ایک اخبار ذوالقرنین میں ہندو مسلم اتحاد کے عنوان سے ایم کے گاندھی کے نام ایک خط لکھا جسے اپنے قلمی نام عبدالقادر بلگرامی کے نام سے شائع کرایا تھا جو بعد میں کتابچے کی شکل میں 1925ء میں علی گڑھ سے ”اوراقِ گمشدہ“ میں شائع ہوا جس میں ہندو مسلم مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی تھی اور ہندوستان میں اس مسئلے کے پس منظر پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ اس میں انہوں نے تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان کو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کتابچے میں بلگرامی نے مسلمانوں کی اکثریت والے اضلاع کی فہرست بھی دی تھی<sup>30</sup>۔

**مولانا اشرف علی تھانوی (1863ء - 1943ء):**

مولانا اشرف علی تھانوی مسلمانوں کے ایک جید عالم تھے۔ وہ کوئی سیاسی شخصیت نہ تھے مگر ایک عالمِ دین ہونے کے سبب انہیں برصغیر کے مسلمانوں کی تکالیف کا پورا احساس تھا۔ ان کے ایک دوست کے حوالے سے پتہ چلا کہ 1928ء میں انہوں نے ہندوستان کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا تا کہ مسلمانوں کو ایک آزاد اور خود مختار خطہ زمین مل سکے جہاں برصغیر کے مسلمان آزادی کے ساتھ اپنا دین رائج کر سکیں اور اپنی تہذیب و تمدن کو پروان چڑھا سکیں۔ دراصل یہ کہنا بہتر ہوگا کہ مولانا اشرف علی تھانوی کا ہندوستان کی تقسیم کا نقطہ نظر سیاسی نہیں بلکہ دینی تھا جہاں وہ اپنے ذہن کے مطابق دارالسلام بنانا چاہتے تھے<sup>31</sup>۔

**مرتضیٰ احمد خان میکش (1899ء - 1959ء):**

مرتضیٰ احمد خان میکش روزنامہ ”انقلاب“ لاہور کے ایڈیٹر مل سٹاف کے رکن تھے جنہوں نے 1928ء میں ”ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی“ کے عنوان سے بہت سے مضامین لکھے۔ 9 دسمبر 1928ء کی اشاعت میں انہوں نے اپنے مضمون بعنوان ”ہندوستان

کے مسلمانوں کے لیے وطن کی ضرورت، پر ہندوستان کے سیاسی مسائل کا حل تجویز کرتے ہوئے لکھا کہ:-

”پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان مسلمانوں کے لیے تیار شدہ وطن ہے جہاں ہندوستان کے مسلمان اپنے مذہب، اپنے کلچر، اپنے معاشرے کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکیں اور اپنی زندگی گزار سکیں۔“<sup>32</sup>

ہندوؤں کے مشہور روزنامہ ”پرتاپ“ لاہور نے اس مضمون پر شدید نکتہ چینی کی اور لکھا کہ ”برصغیر کے مسلمان ہندوستان میں ایک اسلامستان بنانا چاہتے ہیں اور ہندوؤں کو اس تجویز کے خلاف اکسایا جس پر 9 دسمبر 1928ء کو ”انقلاب“ میں ہی مرتضیٰ احمد خان میکش نے لکھا:-  
”اگر یورپ میں کوئی اصول لاگو ہو سکتا ہے تو براعظم ہندوستان میں وہی اصول مسلمانوں پر کیوں لاگو نہیں ہو سکتا۔“<sup>33</sup>

**ذوالفقار علی خان (1873ء - 1933ء):**

نواب صاحب ریاست مالیر کوئٹہ کے حکمران خاندان کے ممتاز فرد تھے اور برصغیر کے مسلمانوں کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں مسلمانوں کی آزادی کا واضح تصور تھا جسے انہوں نے 30 دسمبر 1929ء کو لاہور کانفرنس میں پیش کیا۔ خلافت کانفرنس میں ان کی تقریر کے اقتباسات برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے ان کی تڑپ کے غماز ہیں:-

”ہندوستان کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جہاں سات کروڑ افراد پر مشتمل ایسا فرقہ موجود ہو جو مذہب کے اعتبار سے ایک ہو۔ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ اکیس کروڑ افراد کے فرقے کو تو قوم تصور کر لیا جائے، چھ کروڑ اچھوت جو سینکڑوں جاتیوں میں بے ہوئے ہیں اور جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ایک زباں لیکن کیونکہ انہیں مجموعی طور پر ہندو کہتے ہیں اس لیے انہیں ایک قوم تصور کر لیا جاتا ہے لیکن مسلمان جن میں اخوت کا جذبہ ہے، رنگ و نسل کے امتیاز

سے بالاتر جن کا طرز زندگی ایک نمونہ ہے انہیں محض ایک فرقہ وارانہ گروپ سمجھا جاتا ہے اور ان کی علیحدہ ہستی کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا<sup>34</sup>۔

مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں پر یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ ہندوستان کا مسئلہ ایک فرقے کا مسئلہ نہیں بلکہ دو مستقل فرقوں کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کا قتل نام تو ہو سکتا ہے اور انہیں ہجرت پر بھی مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن سیاسی اعتبار سے نہ تو انہیں دوسری قوموں میں مدغم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسری قوم کی حکمرانی تسلیم کر سکتے ہیں۔

”ہندوستان کی آزادی اور ترقی کا دار و مدار اس پر ہے کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کو ایسا علاقہ دیا جائے جو دو یا تین صوبوں پر مشتمل ہو یا اسے ایک صوبے میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس علاقے یا صوبے میں مسلمانوں کی آبادی %80 الگ ہو جائے۔ مسلمانوں کے حقوق کی بحالی کی بجائے ایک الگ ملک اور وطن کا مطالبہ کرنا چاہیے“<sup>35</sup>۔

**فضل کریم خان درانی** (\*.....1946ء):

فضل کریم درانی کئی ہفت روزہ اخبارات کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون ”ہندوستان میں اسلام کا مستقبل“ کے عنوان سے 1929ء میں لکھا:۔

”میں برس ہا برس سے ایک خواب دیکھ رہا ہوں اور اب وقت آ گیا ہے کہ میں اسے اپنے بھائیوں کے سامنے ظاہر کر دوں۔ یہ خواب ایک مسلم انڈیا کا خواب ہے۔ میں کبھی ہندو مسلم اتحاد پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ ایک وقت تھا جب ہندوستان میں لوگ ہندو مسلم اتحاد کے لیے پاگل ہو رہے تھے لیکن اس وقت بھی میں اس اتحاد کے خلاف تھا۔ دیکھنے اور سوچنے والوں کے لیے گزشتہ دس سالوں میں ایک بات واضح ہو گئی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ ریاست کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔ مسلم انڈیا کی

بات پر ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی سی شکل اختیار کر لی ہے جو کسی طور پر بھی درست نہیں اور ہندوؤں کو اس پر ناراض ہونے کی بھی ضرورت نہیں، وہ مسلمانوں کا کچھ نہیں کر سکتے اگر وہ چاہیں بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک دوسرے کے مخالف کلچر ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ کسی وقت بھی ان کا آپس میں جھگڑا ہو سکتا ہے، دو مختلف سیاسی نظریات، مختلف مذہبی نظریات کسی طور پر بھی باہم نہیں چل سکتے اور آخر کار ایک روز آپس میں لڑ پڑیں گے۔“

”ہندوستان کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ دونوں قوموں میں سے ایک قوم نیست و نابود ہو جائے۔ یا تو مسلمان خودکشی کر لیں اور اپنے آپ کو غائب کر لیں یا قرونِ اولیٰ کے مسلمان اپنا حق چھین لیں۔ اس کے سوا کوئی متبادل طریقہ نہیں ہو سکتا“<sup>36</sup>۔

**علامہ محمد اقبالؒ (1877ء - 1938ء):**

1930ء عظیم تاریخی اہمیت کا سال تھا جب ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کے لیے آزاد وطن کے مطالبے نے قومی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ علامہ محمد اقبالؒ نے اپنا نظریہ 30 دسمبر 1930ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد کے سالانہ تاریخی اجلاس میں پیش کیا:-

”میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔“

اس سے پہلے انہوں نے دو قومی نظریہ کے حوالے سے دو ٹوک انداز میں بات کرتے



ہوئے کہا:۔

”مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں صرف ایک ہی قوم آباد ہو وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل زبان مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال و انفعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔“<sup>37</sup>

علامہ اقبالؒ کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کا ایک علیحدہ تشخص ہو اور مسلمان ایک قابل قدر قوم کی حیثیت سے اپنی زندگی بسر کریں۔ اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے نزدیک سب سے بہترین حل یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ہو جہاں وہ اپنے دین اور روایات کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ علامہ اقبالؒ 1931ء میں دوسری کول میز کانفرنس اور 1932ء میں تیسری کول میز کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنے اسی موقف کا اعادہ کیا یعنی مسلمان ایک علیحدہ تشخص کے حامل ہیں اس لیے ایک الگ سرزمین ہی ان کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اس حوالے سے علامہ اقبالؒ کی قائد اعظمؒ کے ساتھ بھی خط و کتابت رہی۔ اسی طرح اپنے ایک خط مورخہ 28 مئی 1937ء میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ ملک کو ایک یا زیادہ ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح مسلمان اسلامی شریعت بھی نافذ کر سکیں گے۔

**ڈاکٹر سید ظفر الحسن (1879ء - 1949ء) اور ڈاکٹر سید افضال**

**حسین فادری (1912ء - 1974ء):**

”ایگزٹھ“ تحریک پاکستان کے ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جسے کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ”ایگزٹھ“ کے نہ صرف طلبہ نے بلکہ وہاں کے اساتذہ نے بھی تحریک قیام پاکستان کی جدوجہد میں جو کردار ادا کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ ”ایگزٹھ“ کے دو اساتذہ کرام نے 1938-39ء میں تقسیم ہند کی تجویز اس طرح پیش کی تھی کہ ہندوستان کو چند آزاد ریاستوں میں

تقسیم کر دیا جائے:-

- 1- ”پاکستان جو سندھ، سرحد، پنجاب، بلوچستان، ریاست جموں و کشمیر، مالیر کوئٹہ، کپورتھلہ، چترال، دیر، قلات، لوہارو، شملہ اور بہاولپور کی ریاستوں پر مشتمل ہو۔
- 2- بنگال کو بہار کے ضلع پورنیا اور آسام کی سلہٹ ڈویژن پر قائم کیا جائے۔
- 3- ہندوستان جس میں بنگال کا باقی حصہ اور دولت آصفیہ، حیدرآباد، شمالی ہوا اور حیدرآباد جس میں کرناٹک کا حصہ بھی شامل کر لیا جائے“<sup>38</sup>۔

**میجر میاں کفایت علی (ایے پنجابی) (1902ء - 1994ء):**

میجر میاں کفایت علی نے (ایے پنجابی) کے نام سے بہت سی تحریریں شائع کی ہیں۔ انہوں نے 1938-39ء میں انڈستان کے نام سے ایک تجویز پیش کی تھی جسے نواب شاہ نواز خان مدوٹ نے شائع کر لیا۔ یہ سکیم پانچ وفاق پر مشتمل تھی۔ دو وفاق مسلمانوں کے اور تین وفاق ہندوؤں کے۔ پہلے میں کپورتھلہ اور مالیر کوئٹہ شامل تھے۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 82 فیصد تھا۔ دوسرے وفاق میں مشرقی بنگال، آسام، گوالیار اور سلہٹ کے اضلاع تری پورہ اور مشرقی بنگال کے آس پاس کے مسلم اکثریت کے علاقے شامل تھے جس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 66 فیصد تھا۔

ہندوؤں کے تین وفاق میں پہلے وفاق میں سے یوپی، سی پی، بہار، اڑیسہ، آسام، مدراس، بمبئی اور ہندوستان کی کچھ ریاستیں جن میں ہندوؤں کی آبادی 72 تا 83 فیصد تھی۔ دوسرے وفاق میں راجستھان اور وسط ہند کی ریاستیں شامل کی گئی تھیں جن میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب 86 تا 93 فیصد تھا۔ جبکہ تیسرا ہندو وفاق حیدرآباد (دکن) اور میسور کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ اس میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب 82 تا 88 فیصد تھا لیکن اس سکیم میں جو سب سے بڑا نقص تھا وہ یہ کہ ان پانچوں وفاق پر مشتمل ایک کنفیڈریشن کا تصور دیا گیا تھا<sup>39</sup>۔

**ڈاکٹر سید عبداللطیف (1891ء - 1971ء):**

ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تجویز کو منطقوں کی تجویز کا نام دیا گیا کیونکہ انہوں نے 1938-39ء میں برصغیر کو منطقوں کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا فارمولا پیش کیا جس کے مطابق مسلمانوں کے لیے پانچ اور ہندوؤں کے لیے گیارہ منطقے قائم کیے گئے یعنی:-

- 1- شمال مغربی منطقہ جس میں سندھ، بلوچستان، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ ریاست خیرپور اور ریاست بہاولپور شامل تھے۔
- 2- دوسرا منطقہ شمال مشرقی منطقہ کہلائے گا جس میں بنگال اور آسام شامل ہونگے۔
- 3- تیسرا منطقہ لکھنؤ اور دہلی پر مشتمل ہوگا جس میں یوپی کے علاقے اور بہار کے مسلم اکثریت والے علاقے جو پٹالہ اور رام پور سے ہوتے ہوئے لکھنؤ تک شامل ہونگے۔
- 4- چوتھا منطقہ ریاست حیدرآباد (دکن) کرناٹک، کڑپا، چتوڑ، شمالی ارکاٹ اور چنگل پت سے ہونا ہو اور اس شہر تک کے علاقے پر مشتمل ہوگا۔
- 5- پانچویں منطقہ میں راجپوتانہ، گجرات اور مغربی ہند میں مسلمان اکثریت والے علاقے پر مشتمل مسلمانوں کے لیے ایک منطقہ بنانے کی تجاویز شامل تھیں<sup>40</sup>۔

**سر سکندر حیات (1892ء - 1942ء):**

اتحاد پارٹی پنجاب کے لیڈر سر سکندر حیات نے پارٹی کی جانب سے 1938-39ء میں تقسیم ہند کی ایک تجویز پیش کی تھی جو ایک کتابچے کی شکل میں شائع ہوئی۔ اس کے مطابق برصغیر کو سات حلقوں میں مندرجہ ذیل طور پر تقسیم کیا گیا تھا:-

- 1- آسام، بنگال، ریاست ہائے بنگال اور سکم۔
- 2- بہار، اڑیسہ، بنگال کے مغربی اضلاع۔
- 3- صوبہ متحدہ اودھ اور آگرہ۔

- 4- صوبہ مدراس ریاست ٹراونکور اور گورگ۔
- 5- بمبئی، حیدرآباد ریاست ہائے مغربی ہندوستان، میسور اور وسطی ہند۔
- 6- ریاست ہائے راجپوتانہ، گوالیار مرکزی ہندوستانی ریاستیں، بہار، اڑیسہ، سی پی اور برار۔
- 7- پنجاب صوبہ سندھ، سرحد، کشمیر اور بلوچستان، بیکانیر اور جیسلمیر پر مشتمل علاقوں کو سات حلقوں میں تقسیم کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن اس تجویز میں یہ کہیں نہیں کہا گیا تھا کہ آیا یہ حلقے کسی وفاق کے تحت ہوں گے یا خود مختار ہوں گے۔ بہر حال تقسیم ہند کی یہ ایک تجویز ضرور تھی<sup>41</sup>۔

(اس دوران پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، لاہور کی طرف سے خلافت پاکستان کے عنوان کے تحت اور مجلس کبیر پاکستان، لاہور کی طرف سے تقسیم ہند کی تجاویز بھی سامنے آئیں)

#### چودھری خلیق الزماں (1889ء-1973ء):

چودھری خلیق الزماں، نادر علی وکیل کی اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-  
 ”انہوں نے اپنی تجویز میں نہ تو اعداد و شمار پیش کیے اور نہ ہی مذہبی علاقوں کا تعین کیا کہ وہ کن کن علاقوں میں ہندو، ہندوستان اور مسلم ہندوستان بنانا چاہتے ہیں۔“<sup>42</sup>

انہوں نے اپنی تجویز 20 مارچ 1939ء میں حکومت برطانیہ کو پیش کی جس کے مطابق برصغیر جنوبی ایشیا کو تین فیڈریشنوں میں تقسیم کرنے کی تجویز تھی۔ پہلی فیڈریشن پنجاب، کشمیر، سندھ، بلوچستان پر مشتمل تھی۔ دوسری فیڈریشن بنگال اور آسام، تیسری میں بھارتیہ ہندوستان۔ ریاستوں کے مسئلے کے حل کے لیے تجویز کیا گیا تھا کہ جو ریاست ہندو فیڈریشن میں شامل ہو وہ ہندوؤں کے ساتھ اور جو مسلم فیڈریشن میں واقع ہو وہ مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو جائیں گی۔ ہندو اور مسلم فیڈریشن آزاد ہوں گی۔ عبوری دور کے لیے ان کا دفاع ایک علیحدہ ادارے کے سپرد کر دیا جائے جو مجلس قانون ساز کے دائرہ اختیار میں نہ ہو۔ حکومت برطانیہ کا اقتدار ختم ہو جانے

کے بعد فیڈریشنوں کا دفاع ان کے سپرد کر دیا جائے۔

### اسد اللہ سکیم:

1939ء میں پیش کی گئی اسد اللہ سکیم میں مولانا عبدالحلیم شرر کی طرح پورے شمالی ہندوستان کو مسلمانوں کا علاقہ قرار دیتے ہوئے تجویز پیش کی گئی تھی کہ پورے شمالی ہندوستان جس میں پنجاب، سندھ، بلوچستان، کشمیر، سرحد اور دہلی کے اوپر کا حلقہ شامل تھا مسلمانوں کو جب کہ جنوبی ہندوستان جو کہ یوپی، بہار، سی پی، مدراس، بمبئی، حیدرآباد اور میسور پر مشتمل تھا ہندوؤں کو دیا جائے اور مشرقی بنگال، آسام اور بہار پر مشتمل علاقہ بھی اسی تجویز کا حصہ تھا<sup>43</sup>۔

### سر عبداللہ ہارون (1872ء - 1942ء):

1940ء میں یہ سکیم جس کمیٹی نے پیش کی اس کے صدر سر عبداللہ ہارون تھے۔ اس اسکیم کے تحت تجویز کیا گیا تھا کہ برصغیر کو تین وفاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک وفاق شمال مغرب میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 63 فیصد تھا، دوسرا وفاق شمال مشرق میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 56 فیصد تھا اور تیسرا وفاق باقی ہندوستان<sup>44</sup>۔

### سرفیروز خان نون (1893ء - 1970ء):

سرفیروز خان نون نے 1942ء میں عیگڑھ میں اپنی تقریر کے دوران یہ تجویز پیش کی تھی کہ برصغیر پاک و ہند کو پانچ مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے:-

1- ”مجوزہ مملکت نمبر ایک پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان پر مشتمل ہوگی؛

2- دوسری مملکت آسام اور بنگال پر؛

3- تیسری مملکت صوبہ جات متحدہ بہار، صوبہ متوسط اور اڑیسہ؛

4- چوتھی مملکت صوبہ بمبئی اور

5- پانچویں مملکت صوبہ مدراس پر مشتمل ہوگی<sup>45</sup>۔

یہ پانچوں آزاد ریاستیں اپنے نمائندوں کے ذریعے وفاق (مرکز) قائم کریں اور



وفاق کے سپرد خارجہ امور اور کرنسی ہو۔ اگر ان مملکتوں میں سے کوئی مرکز کی حکمت عملی سے مطمئن نہ ہو تو اسے اختیار حاصل ہوگا کہ وہ مرکز سے علیحدگی اختیار کر لے اور اپنے آپ کو جد کر لے۔

### سی آر فارمولا:

8 اپریل 1944ء کو راج گوپال اچاریہ (1879ء-1972ء) نے قائد اعظم محمد علی جناح کو ایک طویل خط لکھا جس میں چند اہم نکات پیش کیے۔ یہی نکات بعد میں سی آر فارمولا کے نام سے مشہور ہوئے جو مندرجہ ذیل ہیں:-

1- ”مسلم لیگ برصغیر کی آزادی کی حمایت کرے گی اور عبوری دور کے لیے ہندوستان میں حکومت بنانے میں کانگریس کا ساتھ دے گی؛

2- اختتام جنگ کے بعد شمال مغرب اور مشرقی اضلاع میں جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی حد بندیوں کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ اس طرح حدود کے تعین کے بعد جو علاقے اندرون حدود ہوں گے وہاں کے تمام باشندوں کی رائے حاصل کی جائے گی۔ استنصواب رائے میں جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ اس طرح آخری فیصلہ تصور کیا جائے گا کہ ان علاقوں کو ہندوستان سے الگ کیا جائے یا نہیں۔ سرحدوں پر جو اضلاع واقع ہوں گے ان کو حق حاصل ہوگا کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کر لیں؛

3- ہر دو جماعتوں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کو استنصواب رائے سے قبل اپنے اپنے خیالات عوام کے سامنے پیش کرنے کا موقع فراہم کیا جائے گا؛

4- علیحدگی کے وقت باہمی رضامندی سے دفاع، مواصلات، تجارت اور دوسرے امور طے کرنے کے لیے معاہدہ کیا جائے گا؛

5- آبادی کے تبادلے میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔ ہر شخص اپنی ہی رضا کا پابند ہوگا؛

6- یہ سارے امور صرف اس صورت میں قابل قبول ہوں گے جبکہ ہندوستان کو حکومت برطانیہ پورے اختیار اور ذمہ داریاں منتقل کر دے“<sup>46</sup>۔

یہ فارمولا قائد اعظم نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں پیش کرنے کے بعد جواب دیئے کا وعدہ کیا جس پر راج کو پال اچا یہ تیار نہ تھے اور چاہتے تھے کہ قائد اعظم مجلس عاملہ سے اس بارے میں رائے نہ لیں جس پر یہ تجویز خود بخود ختم ہو گئی۔

**فائد اعظم محمد علی جناح** (1876ء - 1948ء):

برصغیر جنوبی ایشیا میں علامہ اقبال نے قومیت کے اس نظریے کو اجاگر کیا جو مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کے حصول کی بنیاد قرار دیا گیا۔

اسی نظریے کی بات آگے بڑھاتے ہوئے قائد اعظم نے 22 مارچ 1940ء کو لاہور میں ہونے والے مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کے خطبہ صدارت میں برملا کہا کہ:

”قوم کی خواہ کوئی بھی تعریف کی جائے، مسلمان اس تعریف کے مطابق ایک قوم ہیں اور ان کا اپنا وطن ان کا اپنا علاقہ اور ان کی اپنی مملکت ضرور ہونی چاہیے۔ ہم ایک آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن و اتفاق کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اپنی پسند اور امنگوں کے مطابق اور اپنے معیار اور نصب العین کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی روحانی، ثقافتی، اقتصادی، سماجی اور سیاسی زندگی کو بہترین اور بھرپور طریقے پر ترقی دے سکے“<sup>47</sup>۔

بعد ازاں ایسوسی لیٹڈ پریس امریکا سے یکم جولائی 1942ء کو بات کرتے ہوئے انہوں نے دو قومی نظریے کو اس طرح بیان کیا:

”ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے ایک قوم ہیں۔ زبان اور ادب، فنون لطیفہ، فن تعمیر، نام اور نام رکھنے کا طریقہ، انداز اور تناسب کا شعور، قانونی اور اخلاقی ضابطے، رسوم اور جنسری تاریخ اور روایات، رجحانات اور امنگیں ہر ایک لحاظ سے ہمارا اپنا انفرادی زاویہ نگاہ اور

فلسفہ حیات ہے۔ بین الاقوامی قانون کی ہر تعریف کے مطابق ہم ایک قوم ہیں<sup>48</sup>۔

3 جولائی 1943ء کو آپ نے ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ”یہ محض مذہبوں کا فرق نہیں ہے کیا تمہاری ثقافت مشترک ہے؟ کیا تمہاری معاشرتی زندگی مشترک ہے؟ کیا تمہارا قانون مشترک ہے؟ آخر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا چیز مشترک ہے؟“<sup>49</sup>۔

ایڈورڈ کالج پشاور میں 27 نومبر 1945ء کو قائد اعظم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

”ہم دونوں قوموں میں فرق صرف مذہب کا نہیں بلکہ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمارا ضابطہ حیات الگ ہے جو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے“<sup>50</sup>۔

اس سے پہلے 14 اپریل 1941ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس کے موقع پر قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:-

”مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لیے جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے ہی دم لیں گے“<sup>51</sup>۔

قائد اعظم نے اپنے اس دعوے کو اس شد و مد سے دہرایا کہ مخالفین بھی اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ آل انڈیا کانگریس کے ممتاز رکن این سی دت نے اپنے کلمے خط میں جو کیم فروری 1940ء کو بجنور سے شائع ہونے والے ایک اخبار ”مدینہ“ میں شائع ہوا لکھا: ”ان حالات میں ہندو مسلم تصفیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ قومیں مان لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا جائے۔“

### دو قومی نظریہ - مسلمانوں کی ترقی کا ضامن:

دو قومی نظریے کا تعلق صرف برصغیر سے ہی نہیں ہے۔ یہ نظریہ پورے کرۂ ارض سے عبارت ہے۔ اس نظریے کے تحت ہم دنیا کو مسلم اور غیر مسلم دنیا میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جغرافیائی عناصر سے یہ ممکن ہے کہ ملتِ اسلامیہ دوسری اقوامِ عالم کی ہم زبان، ہم وطن، ہم نسل ہو جائے لیکن ہم اسے ان اقوام کا ”جزو“ قرار نہیں دے سکتے۔ مثلاً امریکا، چین، روس وغیرہ میں رہنے والوں کو ہم امریکی، چینی، روسی تو کہہ سکتے ہیں لیکن ان ممالک میں رہنے والے مسلمان ملتِ اسلامیہ کا لازمی جزو ہی رہیں گے۔ عرب ممالک میں عیسائی اور یہودی ہزاروں سال سے باہم ایک جگہ رہنے کے باوجود ایک قوم نہیں بن سکے۔

اسی حقیقت کے پیش نظر قائد اعظمؒ نے قیامِ پاکستان کے بعد بھی دو ٹوک انداز میں بات کرتے ہوئے 25 اکتوبر 1947ء کو ایک غیر ملکی نامہ نگار مسٹر ہوپر سے کہا کہ:-

”جہاں تک دو قومی نظریے کا تعلق ہے، یہ محض ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اسی حقیقت کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ اور باتوں سے قطع نظر اس حقیقت کی تصدیق حکومتِ ہندوستان کے اس اقدام سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے پاکستان سے ہندوؤں کو نکالنے کی کوشش کی ہے۔ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ برصغیر میں صرف ایک قوم رہتی ہے۔ کچھ اور واقعات و حالات بھی ایسے ہو رہے ہیں جو اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہندوستان کی مملکت ایک ہندو مملکت ہے۔“<sup>52</sup>

### دو قومی نظریہ اور ہندوؤں کی تنگ نظری:

عقیدے اور مذہب کی حیثیت سے ہندو مذہب مبہم اور غیر معین پہلو رکھتا ہے۔ ہندو دنیا کی پست ہمت، عسکری روایات سے محروم واحد قوم ہے جس میں شجاعت و بہادری کی بجائے تعصب، کینہ پروری اور تنگ نظری کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ ہل ہند کو حکمرانی کے

بہت سے مواقع ملے مگر وہ سازگار ماحول کے باوجود کوئی اچھا تاثر قائم نہ کر سکے۔ صدیوں کی غلامی نے ان کا قومی کردار ہی تباہ کر دیا تھا۔ گائے کے تقدس اور دیگر جانوروں کی حرمت کے غیر فطری جذبات نے ان کی ترقی کی راہیں مسدود کر دی تھیں۔ دوسری طرف چھوت چھات اور ذات پات کے امتیاز نے ان میں برتری کے احساسات کو جنم دیا جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی ہی قوم کے ادنیٰ کام کرنے والوں یعنی شودروں کو نہ صرف سماجی بلکہ بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیا۔

دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں ان کی بنیاد اخوت اور انصاف پر ہے مگر ہندو ازم درجہ بندی عدم مساوات اور تقسیم انسانیت پر مبنی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر کبھی متحد نہیں رہا۔ اگرچہ ہندو تاندین تاریخی حقائق کے برخلاف اپنے مذموم عزائم کے حصول کی تکمیل کے لیے اسے ”گاؤ مانا“ سے تشبیہ دے کر گمراہی پھیلاتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند زمانہ قدیم سے کئی ٹکڑوں میں تقسیم چلا آتا ہے۔ یہاں کے اصل باشندوں کو شمال سے آنے والے حملہ آوروں نے جنوب کی طرف بھگا دیا اور خود اس سرزمین پر ”ہندو“ کے نام سے مسلط ہو کر اپنی نسلی برتری برقرار رکھنے اور اپنی قیادت کو دوام دینے کے لیے انسانیت کی اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ بندی کرتے ہوئے معاشرے کو چار غیر انسانی طبقوں میں تقسیم کر دیا۔

برصغیر میں مسلمانوں نے اپنی آمد کے بعد گروہی سماجی اور طبقاتی تقسیم ختم کر کے برصغیر کو ایک وحدت میں بدلنے کا فریضہ انجام دیا۔ اشاعت اسلام کے سلسلے میں صوفیائے کرام نے بے پایاں خدمات انجام دیں جس کے نتیجے میں برصغیر کی پوری معاشرت اور تمدن پر حیرت انگیز مفید اثرات مرتب ہوئے۔ ایک ہزار سالوں پر محیط طویل دور حکومت کے باوجود برصغیر میں مسلمان ایک اقلیت ہی رہے اور اسلامی حکومتوں کے پایہ تخت دہلی، آگرہ، لکھنؤ وغیرہ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔

برصغیر میں مسلمانوں پر سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے ہندوؤں کے عزائم نے مسلمانوں

میں باہمی اتحاد جداگانہ قومی تشخص کے مفید جذبات اور تحریکوں کو جنم دیا۔ ہندوؤں نے ان تحریکوں کی بھرپور مزاحمت کی۔ مسلمان اپنے تمدن، معاشرتی اقدار اور مذہب کو خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتے تھے۔ وہ اپنا تحفظ چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے تحت الشعور میں اپنے تحفظات کے جو جذبات پرورش پا رہے تھے انہیں حصول پاکستان کے بے نام تصور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کے معاندانہ ہندو رویے نے مسلمانوں کو اپنے ملٹی تشخص کے تحفظ کے لیے وسیع تر قومی مفاد میں قائد اعظمؒ کی فقید المثال قیادت میں متحد ہونے پر مجبور کر دیا۔ مسلمان قوم نے ہر قسم کے فروعی اور گروہی اختلافات بھلا دیئے اور قوم ایک جسد واحد بن کر ابھری۔

تحریک پاکستان کے سلسلے میں یہ نکتہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ وہ صوبے جہاں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کو یہ یقین تھا کہ ان کے علاقے پاکستان کا حصہ نہیں بن سکیں گے، پھر بھی انہوں نے دوسرے مسلمانوں کا بھرپور ساتھ دیا۔

دو قومی نظریہ تحریک پاکستان کی رُوح اور قیام پاکستان کی بنیاد ہے۔ قائد اعظمؒ محمد علی جناحؒ پاکستان کو اسلام کی عملی تجربہ گاہ بنانا چاہتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ پاکستان اتحادِ عالم اسلام کا داعی بنے اور مسلم ممالک کو متحد کرے۔

دو قومی نظریہ..... جس کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا، اگر ہم تحقیقی جائزہ لیں تو کشمیر، فلسطین اور افریقی ممالک کے مسائل کا حل صرف اسی دو قومی نظریے کی رُوح کو سمجھنے سے ہو سکتا ہے اور دو قومی نظریہ ہی تمام مسلمانوں کی ترقی کا ضامن ہے۔



## حوالہ جات

- 1 دی نیو انٹیلو پیڈیا بریٹانیکا، جلد 11، ایڈیشن پندرہواں، شکاگو، 1998ء، ص 918
- 2 اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر۔ نظریہ پاکستان کے تاریخی، سیاسی اور معاشرتی پہلو، نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور، 1999ء، ص 12
- 3 ڈیوڈ رابرٹسن، دی پیٹری آف پولینڈ، پیٹری گروپ، 27 رائنس لین لندن، 1993ء
- 4 نہرو جواہر لال، این آٹو بائیو گرافی، لندن، 1936ء
- 5 نہرو جواہر لال، دی ڈسکوری آف انڈیا، نیویارک، 1946ء
- 6 'کاسٹ ان انڈیا' جے ایچ، بھنس، بمبئی، 1961ء، ص 50
- 7 کتاب الہند، مترجم سید اعظمی، الفیصل، لاہور، 1994ء، ص 6
- 8 تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص 238
- 9 دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ کراچی، 1968ء، ص 3؛ مزید دیکھیے: سلیکنڈ سپر آف جان براؤٹ آن پبلک کونجشن، جے ایم ڈیٹ اینڈ سنز لمیٹڈ، لندن، ص 14؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 7
- 10 دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ کراچی، 1968ء، ص 3؛ مزید دیکھیے: حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، لاہور، ص 94؛ ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان، ایس۔ ایم۔ اکرام، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز، کلب روڈ، لاہور، اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 13-14؛ تحریک آزادی، صلاح الدین، اسک، لاہور، ص 159
- 11 دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ کراچی، 1968ء، ص 3؛ مزید دیکھیے: حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، لاہور، ص 94؛ ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان، ایس۔ ایم۔ اکرام، لاہور، اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول

- کے کے عزیز، لاہور، ص 13، 14: تحریک آزادی، صلاح الدین، ماسک، لاہور، ص 159
- 12- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 38؛ مزید دیکھیے: انڈیا انڈر ریپون، اے پرائیویٹ ڈائری، ڈبلیو ایس بلنٹ، لندن 1909ء، ص 107، 108
- 13- ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، نیشنل بک فاؤنڈیشن، 1977ء، ص 19
- 14- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ کراچی، 1968ء؛ ص 4؛ مزید دیکھیے: کاروان صحافت، عبدالسلام خورشید، لاہور، 1964ء؛ ص 67؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 42، 43؛ اور بکن آف پاکستان، عبدالسلام خورشید، پی ٹی، 1962ء
- 15- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 85؛ مزید دیکھیے: دی انٹرویو، بمبوق، کامریڈ، 10 مئی، 1913ء
- 16- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ کراچی، 1968ء؛ ص 7؛ مزید دیکھیے: پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 149-153؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 86؛ دی فاؤر لینڈ آف دی پاک نیشن، چودہری رحمت علی، کیمبرج، اشاعت سوم، 1947ء؛ ص 213، 214
- 17- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ کراچی، 1968ء؛ ص 4؛ مزید دیکھیے: پروسیدنگز شاکیہوم کانفرنس آف سوشلسٹ انٹرنیشنل، ص 407، 408؛ پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 576، 577؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 89
- 18- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 157؛ مزید دیکھیے:

اے کانسٹی ٹیوشن فار انڈیا، گروپنگ آف فری سٹینس، دی باوریاں ماڈل، سر آغا خان، مطبوعہ دی  
 مائمنز، 13 اکتوبر 1928ء، انڈیا ان ٹرانزیشن، اے سٹڈی ان پولیٹیکل ایوولیوشن، آغا خان، لندن،  
 1918ء، ص 37؛ پری لیوڈ ٹوپا کستان (1940ء-1930ء)، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص  
 76، 77؛ دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لائبریری، سید شریف الدین پیرزادہ،  
 کراچی، 1968ء، ص 5

19- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 111؛ مزید دیکھیے:  
 پاتھ وے ٹوپا کستان، خلیق الزماں، لاہور، 1961ء، ص 238

20- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لائبریری، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء،  
 ص 5؛ مزید دیکھیے: رپورٹ آف دی مارتھ ویسٹ فرنیئر انکوائری کمیٹی، 1924ء، ص 122؛ اے  
 ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 116

21- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لائبریری، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء،  
 ص 5؛ مزید دیکھیے: اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور،  
 ص 80؛ ہندو نیشنل موومنٹ، بھائی پرمانند، لاہور، 1929ء، اور سٹوری آف مائی لائف، طبع مائی،  
 لاہور، 1937ء

22- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 117؛ افادات و  
 ملفوظات حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، محمد سرور، لاہور، 1972ء، ص 144

23- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لائبریری، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء،  
 ص 5؛ رپورٹ آف دی مارتھ ویسٹ فرنیئر انکوائری کمیٹی، 1924ء، ص 122؛ پری لیوڈ ٹوپا کستان،  
 جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 358، 359؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد  
 اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 113؛ انڈین اینوئل رجسٹر، 1922ء، ص 403، 404

24- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لائبریری، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء،  
 ص 5؛ مزید دیکھیے: رپورٹ آف دی مارتھ ویسٹ فرنیئر انکوائری کمیٹی، 1924ء، ص 122؛ پری

- 25- لیوڈ ٹو پاکستان، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 358، 359؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 113؛ انڈین اینوئل رجسٹر، 1922ء، ص 403، 404؛ دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسلم ورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 6؛ مزید دیکھیے: دی کامریڈ (دہلی) 5 جون، 1925ء؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 73
- 26- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسلم ورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 6؛ مزید دیکھیے: دی کامریڈ (دہلی) 5 جون، 1925ء؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 73
- 27- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسلم ورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 6؛ مزید دیکھیے: دی کامریڈ (دہلی) 5 جون، 1925ء؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 73
- 28- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 145؛ مزید دیکھیے: 30 نومبر، اور 5، 14 اور 17 دسمبر 1924ء، کوٹریپیون، لاہور میں شائع ہونے والے ان کے مضامین؛ دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسلم ورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 5
- 29- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 145؛ مزید دیکھیے: 30 نومبر، اور 5، 14 اور 17 دسمبر 1924ء، کوٹریپیون، لاہور میں شائع ہونے والے ان کے مضامین؛ دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسلم ورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 5
- 30- ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص 48؛ مزید دیکھیے: اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، ص 99
- 31- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 156؛ مزید

دیکھیے: بقیر پاکستان اور علمائے ربانی، منشی عبدالرحمان خاں، ملتان، 1956ء، ص 48؛ ”حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور آل انڈیا مسلم لیگ“، مطبوعہ ”ابلاغ“، فروری 1970ء، ص 29

32- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 167، 168؛ مزید دیکھیے: اور یجن آف پاکستان، ٹرینڈز دیٹ لیڈ ٹو پارٹیشن، عبدالسلام خورشید، دی پاکستان مائمنز، 23 مارچ 1962ء؛ صحافت پاکستان اور ہند میں، عبدالسلام خورشید، لاہور، 1963ء، ص 451؛ مرتضیٰ احمد خان میکش کے مضامین بعنوان ”ہندی مسلمان کے لیے الگ وطن“، میکش کا ایک اور مضمون ”پاکستان کا بانی کون؟“، مشرق (روزنامہ) یکم اپریل 1964ء

33- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 167، 168؛ مزید دیکھیے: اور یجن آف پاکستان، ٹرینڈز دیٹ لیڈ ٹو پارٹیشن، عبدالسلام خورشید، دی پاکستان مائمنز، 23 مارچ 1962ء؛ صحافت پاکستان اور ہند میں، عبدالسلام خورشید، لاہور، 1963ء، ص 451؛ مرتضیٰ احمد خان میکش کے مضامین بعنوان ”ہندی مسلمان کے لیے الگ وطن“، میکش کا ایک اور مضمون ”پاکستان کا بانی کون؟“، مشرق (روزنامہ) یکم اپریل 1964ء۔

34- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 176-171؛ مزید دیکھیے: آل انڈیا خلافت کانفرنس لاہور کا خطبہ، استقبالیہ، جنوابع سر ذوالفقار علی خان نے 31 دسمبر 1929ء کو دیا، لاہور، ص 26-15؛ دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 6؛ اور یجن آف دی آئیڈیا فار سپر یٹ مسلم سٹیٹ، افضل رفیق، ص 189

35- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 176-171؛ مزید دیکھیے: آل انڈیا خلافت کانفرنس لاہور کا خطبہ، استقبالیہ، جنوابع سر ذوالفقار علی خان نے 31 دسمبر 1929ء کو دیا، (مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور، ص 26-15)؛ دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 6؛ اور یجن آف دی آئیڈیا فار سپر یٹ مسلم سٹیٹ، افضل رفیق، ص 189

36- پری لیوڈ ٹو پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 106-78؛ مزید دیکھیے: اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 162؛ دی نیو جہ آف اسلام ان انڈیا، ایف کے درانی، لاہور، 1929ء، ص 12

37- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 6؛ مزید دیکھیے: خطبہ اللہ آباد، 1930، محکمہ فلم و مطبوعات، وزارت اطلاعات و نشریات، حکومت پاکستان، اسلام آباد، ص 14؛ مزید دیکھیے: اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 193؛ آل انڈیا مسلم لیگ، اللہ آباد سیشن، دسمبر 1930، صدارتی خطبہ ڈاکٹر محمد اقبال، لاہور، ص 1

38- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 11؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 592-593

39- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 11

مزید دیکھیے: پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 531-535

40- پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)، جلد اول، کے کے عزیز، لاہور، ص 443-454؛ مزید دیکھیے: دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 10

41- پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 539-545؛ مزید دیکھیے: دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی مسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 10؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 560



- 42- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی ہسٹوری لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 7؛ مزید دیکھیے: ”انڈین کانسنٹی ٹیوشنل پراہلمز“، ان مائنٹیننہ سچری، 1939ء، ص 292، 293؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 487، 488
- 43- پری لیوڈ ٹوپا پاکستان (1940ء-1930ء)، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 592، 593
- 44- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی ہسٹوری لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 13؛ مزید دیکھیے: اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 608
- 45- پری لیوڈ ٹوپا پاکستان (1940ء-1930ء)، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 956، 957
- 46- ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص 143
- 47- دی پاکستان ریزولوشن اینڈ دی ہسٹوری لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص 51-35؛ مزید دیکھیے: ری پروڈیوس بائی ڈاکٹر اشرف ان پاکستان، ص 106-100؛ پری لیوڈ ٹوپا پاکستان (1940ء-1930ء)، جلد دوم، کے کے عزیز، لاہور، ص 913-910
- 48- سچر، سینیٹ منٹنس اینڈ میسیجر آف دی قائد اعظم، جلد سوم، خورشید احمد خان یوسفی، نزم اقبال، لاہور، 1996ء، ص 1578
- 49- ایضاً، ص 1590
- 50- ایضاً، ص 2124
- 51- ایضاً، ص 1386
- 52- ایضاً، 1996ء، ص 2633